رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۴۴۰

محرم ۱۳۷۴ھ

جلد ۴۳ عدد

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

نعیم صدیقی

جاری کردہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵- اے ذیلدار پارک، اچھرہ — لاہور پاکستان

چندہ سالانہ چھ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پوتے کی وراثت کا
مسئلہ

کچھ مدت سے ہمارے ملک میں اسلامی فقہ کے خلاف یہ شور برپا تھا کہ وہ وراثت کے معاملے میں یتیم پوتوں کے ساتھ انصاف نہیں کرتی ان شور مچانے والوں میں پیش پیش وہ لوگ ہیں جنہیں پوتے کی وراثت کے مسئلہ سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے بلکہ وہ اس مسئلہ کی آڑ میں اور یتیم پوتے کی مظلومی کا نام لیکر یہ ساری دھائی اس لئے مچارہے ہیں کہ اس طرح درحقیقت وہ حدیث و فقہ کے اس تمام ذخیرہ کو جو پچھلی ساڑھے تیرہ صدیوں میں فراہم ہوا ہے محض ایک دفتر بے معنی قرار دینا چاہتے ہیں اور اس کی بنیاد پر تمام اسلامی روایات و قوانین سے اپنا پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں۔ اس مسئلے کا انتخاب خاص طور پر اسی لئے کیا گیا کہ ایک طرف تو یتیم پوتے کی محرومی کا نقشہ کھینچکر عوام کے جذبات سے اپیل کرنا آسان وکار گر ہے اور دوسری طرف یہ منجملہ ان مسائل کے ہے جن پر تمام علمائے اسلام متفق ہیں خواہ وہ کسی مسلک اور کسی فقہ کے پیرو ہوں اور اگر ایک مرتبہ عام لوگوں کے یہ ذہن نشین کرادیا جائے کہ تمام جلیل القدر صحابہ اور سارے ائمہ مجتہدین جنمیں امام ابوحنیفہ ، امام مالک ، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام غزالی، امام ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ جیسے لوگ شامل ہیں یہ سب کے سب ''جاہل ملا'' تھے کہ وراثت کے ایک معمولی سے مسئلے میں قرآن کی رہنمائی کو ٹھیک ٹھیک نہ سمجھ سکے تو پھر بہت آسانی سے پورے ذخیرہ حدیث و فقہ اور تفسیر و تعبیر کو ان کی نظروں میں بےوقعت ٹھہرایا جاسکے گا اور ان نئے مجتہدین کے لئے راستہ صاف ہوجائے گا جو نبی صلی اللہ علیہ و سلم کے لائے ہوئے اسلام کو ادھیڑ کر نئے سرے سے اپنے ڈیزائن اور اپنی تراش خراش کا ایک اسلام تیار کرنا چاہتے ہیں

پوتے کی وراثت کے مسئلے پر

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان کا یہ پمفلٹ اس مہم کے اصل پس منظر کو نمایاں کرنے کے ساتھ ساتھ نفس مسئلہ کی حقیقت کو پوری طرح واضح کرتا ہے اور تفصیل کے ساتھ ان دلائل کو پیش کرتا ہے جن کی بنیاد پر علماء امت نے پوتے کے حق وراثت کو تسلیم نہیں کیا۔ قیمت چھ آنے

ملنے کا پتہ

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان اچھرہ۔ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۴۳ | محرم ۱۳۷۴ھ - مطابق اکتوبر ۱۹۵۴ء | عدد ۱

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ، لاہور
سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

پاکستان کے دونوں بازو آج ایسے ہولناک سیلابوں سے دوچار ہیں جن کی مثال گذشتہ ایک صدی کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ صدہا میل کا لمبا چوڑا علاقہ زیرِ آب ہے۔ ایک طرف سے اگر خبر آتی ہے کہ پانی گھٹنا شروع ہوا ہے تو معاً دوسری جانب سے اطلاع ملتی ہے کہ سطحِ آب اور اونچی ہو رہی ہے۔ پہلا پانی اپنے بہاؤ کے لیے راستہ پا نہیں چکتا کہ اوپر سے کالی گھٹائیں سمندر کے سمندر اور انڈیل دیتی ہیں۔ کیفیت بالکل "آب از سر گذشت" کی ہے۔ تقریباً چار کروڑ افراد بلاواسطہ اس سیلاب کے ریلوں کی زد میں آ گئے ہیں۔ مشرقی پاکستان کی پوری آبادی اور مغربی پاکستان کا بھی ایک ایک فرد اس کی تباہ کاریوں کے نتائج میں حصہ دار ہے۔ مکانات اور جھونپڑے تباہ ہو رہے ہیں۔ اثاثے خس و خاشاک بن کر بہ گئے ہیں، فصلیں زیرِ آب ہیں، مویشی ہلاک ہو گئے ہیں، کھانے پینے کی اشیا کی تباہی نے "مفلسی میں آٹا گیلا" کا سماں پیدا کر دیا ہے، معصوم بچوں کی ایک کثیر تعداد کو موجوں نے اپنی آغوش میں لے لیا ہے، سانپوں اور بچھوؤں نے انسانی جانوں پر الگ یورش کر رکھی ہے، لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ چڑیوں کی طرح درختوں کی شاخوں پر بسیرا لیے رہتے ہیں۔ دھوپ، ہوا اور بارش سے بچاؤ کا کوئی ذریعہ نہیں رہا، حتیٰ کہ تن ڈھانکنے کو ہمارے ہزاروں بھائی بہنیں ایک ایک چیتھڑے کے محتاج ہیں۔ یہ صبر آزما آزمائش گھنٹے دو گھنٹے کی نہیں، دو چار دن کی نہیں بلکہ معاملہ ہفتوں سے گذر کر مہینوں کی گنتی کی طرف جا رہا ہے۔

پھر یہ تباہی افراد ہی کے دائرۂ حیات تک محدود نہیں۔ سارے پاکستان کا پورا نظامِ رسل و رسائل خطرے میں پڑ گیا ہے، ریلوے لائنیں، سڑکیں، پل، تار اور ٹیلیفون کے سلسلے، دفاتر اور ان کی عمارات غرضیکہ ہماری اقتصادی زندگی کے جسم کے رگ و پے کا پورا سلسلہ شکست و ریخت سے دوچار ہے فصلوں

کی تباہی پورے پاکستان کی معیشت کو مجروح کر دینے والی ہے۔ ہمارے تمام صوبائی اور مرکزی تخمینے تہ و بالا ہو جانے والے ہیں اور بہت سے تعمیری منصوبے معرضِ التوا میں جاتے نظر آتے ہیں۔

ادھر پاکستان کے مغربی خطے کا حال یہ ہے کہ کچھ عرصہ قبل انڈیا نے نہری پانی کا قضیہ پیدا کر کے ہزاروں مربع میل علاقے کی شادابی کو خطرے میں ڈال دیا تھا، اور کئی لاکھ افراد کے لیے اقتصادی لحاظ سے موت و حیات کا سوال پیدا کر دیا تھا، دوسری طرف قدرتِ خداوندی نے نظامِ ابر و باد کی باگ کچھ اس طرح موڑ دی تھی کہ ہمارے کھیتوں کا ایک ایک پودا اپنے پتوں کے دستِ دعا کو پھیلائے نمازِ استسقاء میں کھڑا تھا، لیکن درِ اجابت بند تھا لیکن اب اسی خطے کا سب سے بڑا صوبہ بھی ایک انتہائی خوفناک سیلاب کی زد میں آگیا ہے۔ فی الواقعہ یہ ایک جھنجھوڑ دینے والی صورت حالات ہے

سوال یہ ہے کہ طبیعی نظام کے پرسکون سمندر میں یکایک ایسے ہولناک حوادث کے طوفان کیسے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں؟ معمول کی فضا میں یہ غیر معمولی حالات کی بجلیاں کیسے کوند جاتی ہیں؟ یکسانی کے ماحول میں ایسی ہلچل کس بنا پر نمودار ہو جاتی ہے؟ مادے کی آئینی سنت میں اچانک اس طرح کی افت و خیز کہاں سے آ جاتی ہے؟

ایک طبیعات پرست اس کے جواب میں ایک لفظ بول کے رہ جاتا ہے ——— "اتفاق"!

لیکن اس جواب کو سن کر دوسرا سوال فوراً ذہن میں یہ آتا ہے کہ اگر سورج اور چاند اور تاروں کی گردش اتفاقی نہیں ہے، اگر زمین میں کشش محض اتفاقاً پیدا نہیں ہو گئی، اگر مائعات کا نشیب کی طرف بہنا اور اپنی سطح ہموار رکھنا اتفاق کا مرہونِ منت نہیں ہے، اگر مادہ میں سے نمو اور ارادے کی قوت کا ظہور کسی اتفاقی حادثے کا نتیجہ نہیں ہے، اور اگر کائنات کے پورے نظم اور اس کے توافق کی تعبیر لفظِ اتفاق سے نہیں کی جا سکتی تو پھر دنیا کے ان بڑے بڑے حوادث کو جو ہزاروں انسانی زندگیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں اتفاق کے عنوان سے کیسے پیش کیا جا سکتا ہے۔

ایک مادہ پرست ذہن چونکہ مادی اسباب و علل کے پردے کے پیچھے کام کرنے والی قدیر و حکیم ہستی کا شعور نہیں رکھتا اس لیے وہ معمولاتِ فطرت کی حد تک تو طبیعی قوانین کی کھوج کرید کر لیتا ہے،

لیکن جب مثلاً غیر معمولی حوادث کا سامنے آتا ہے تو ان کے پیچھے کام کرنے والا کوئی عقلی قانون وہ پیش نہیں کر سکتا۔ فوق الطبیعی قوانینِ الٰہی کے متعلق یہی جہل و عجز ہے جو "اتفاق" کے پردے میں اپنا منہ چھپا کر دم بخود ہو جاتا ہے۔ کائنات کے حوادث، خصوصاً عالمِ انسانی کے واقعات کی توجیہ "اتفاق" سے کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے اس وسیع و عریض مادی نظام کو ایک اندھی نگری قرار دے دیا جس کا کوئی سر دھڑ نہیں، جس کے تغیرات کے پسِ پردہ کوئی حکیمانہ منصوبہ بندی نہیں، جس کے کسی واقعہ میں کوئی مصلحت و حکمت نہیں، جس کی تاریخِ وجود کے مختلف لمحات میں کوئی ربط نہیں، اور جس کے احوال و شئون کی کڑیوں کو کوئی قانون جوڑنے والا نہیں۔ کیا ایسی اندھی نگری ——— اور اتنے بڑے پیمانے کی اندھی نگری ایک ساعت کے لیے بھی اپنے وجود کو برقرار رکھ سکتی ہے؟

انبیاء علیہم السلام نے جو درسِ معرفت و حکمت دیا ہے اس کے فیض سے مالا مال ہونے والی عقل ہی اس حقیقت کا پورا شعور رکھتی ہے کہ یہ کائنات ایک منظم مملکت ہے اور یہ سارا مادی نظم بالکل آئینی نظم ہے اور اس نظم کے اندر خود عالمِ انسانی سے فطرتِ الٰہیہ کا معاملہ قاعدے قانون کا معاملہ ہے۔ یہاں ایک ذرہ بھی اگر جنبش کرتا ہے تو وہ جنبش لایعنی نہیں ہوتی، یہاں ایک پتہ بھی اگر کھڑکھڑاتا ہے تو اس کی کھڑکھڑاہٹ فطرت کے "لا اینڈ آرڈر" کے تحت با مقصد ہوتی ہے، یہاں پیروں تلے روندا ہوا گھاس کا کوئی تنکا بھی اگر پڑے پڑے کروٹ بدلتا ہے تو الٰہی حکمت کے تحت بدلتا ہے۔

یہ ساری کی ساری مملکت نوعِ انسانی کی بقا کے لیے سازگار بنائی گئی ہے، تمام موجودات کو اس کی خدمت میں لگا دیا گیا ہے، اس میں انسانی ضرورت کی ہر شے کے خزانے بہم پہنچا دیے گئے ہیں اور ان کے منہ کھول دیے گئے ہیں، اور پھر اس وسیع مملکت کے اس ارضی گوشے میں جو انسانی زندگی کے لیے منتخب کیا گیا ہے اولادِ آدم کو علم و خرد اور اخلاقی حس سے آراستہ کر کے ایک امتحانی دور گزارنے کے لیے محدود خود مختاری (AUTONOMY) دی گئی ہے۔ بالفاظِ دیگر خلافت و نیابت کا تاج اس کے سر پر رکھا گیا ہے۔ یہ سب کچھ ایک شرط کے بدلے میں ہے کہ آدمی اپنی آزادی، اپنی عقل، اپنے قوی اور مادی ذرائع و

وسائل کو خدا کی بندگی و اطاعت میں مصروف رکھے اور اپنی خدائی جمانے یا دوسرے جعلی خداؤں کی بندگی و اطاعت میں صرف نہ کرے۔

کائنات کا اصل فرماں روا چونکہ انسانی حواس کے لیے پردۂ غیب میں ہے، لہٰذا آدمی کو بار بار اپنی پوزیشن کے بارے میں دھوکا ہوتا ہے۔ وہ بار بار اس غلط فہمی کا شکار ہوتا رہا ہے کہ اس کائنات میں وہی مختار ہے، اس سے اوپر کوئی اور نہیں۔

اس کی یہی وہ غلط فہمی ہے جس کا ازالہ کرنے کے لیے اور اس کی یہی وہ غفلت ہے جس کا پردہ چاک کرنے کے لیے کائنات کی اصل فرماں روا طاقت ہواؤں اور گھٹاؤں، بجلیوں اور پانیوں، طوفانوں اور زلزلوں کی پولیس اور فوج کو حرکت میں لاتی رہتی ہے اور حادثات کے کوڑوں کی ضرب لگا کر تادیب کرتی ہے۔ یہی ہوا جس پر زندگی کا دارومدار ہے جب حکمِ الٰہی کے تحت بپھر جاتی ہے تو بستیاں کی بستیاں تلپٹ ہو جاتی ہیں۔ یہی گھٹائیں جن کو دعائیں کر کر کے بلایا جاتا ہے جب غضبِ خداوندی کی بجلیاں چمکاتی اور قہر کے اولے برساتی ٹوٹ پڑتی ہیں تو نباتات اور حیوانات اور انسانوں پر قیامت گزر جاتی ہے۔ یہی دریا اور ندی نالے جن کے پانیوں سے کھیتیاں سیراب ہوتی ہیں جب اوپر سے اشارہ پاکر منہ میں جھاگ لائے امڈنے ہیں تو پانی سروں سے گزر جاتا ہے۔

مادہ پرست غیر معمولی طبعی حادثات کی توجیہ کرے گا تو کہے گا کہ آتش فشاں پہاڑ کی تہ میں لاوا ابھر پڑا تھا، وہ امڈ پڑا اور بھونچال آگیا۔ مون سون ہواؤں نے پانی کی زیادہ مقدار بادلوں کی شکل میں کندھوں پر لاد کر کسی علاقے میں آ انڈیلی اور تباہی آگئی۔ پہاڑوں کی برف زیادہ مقدار میں پگھل بہی اور سیلاب آگیا۔ بارش نہ ہوئی اور قحط کی مصیبت آوارد ہوئی۔ یہ توجیہ ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص پولیس کے کسی چھاپے کے بارے میں یہ بیان کر دے کہ سپاہی آئے تو ایک جیپ میں بیٹھ کر آئے، یہ جیپ پٹرول کے زور سے چل رہی تھی اور فلاں سڑک سے ہو کر بستی میں داخل ہوئی، انہوں نے مجرموں کے مقابلے میں بندوقیں اور پستول استعمال کیے جو فولاد سے بنے ہوئے تھے، پھر انہیں گرفتار کیا تو لوہے کی ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں جکڑ لیا۔ چنانچہ وہ ایسے چھاپوں سے بچاؤ کی اسکیم یہ وضع کرے گا کہ جس سڑک سے جیپ آئی تھی

اس کو توڑ پھوڑ کر ناقابلِ گزر بنا دیا جائے، یا جیپ کے پہیوں کو پنکچر کر دیا جائے۔ حادثات خدا کی گورنمنٹ کا پولیس ایکشن ہیں۔ خدا ناشناس ذہن اس ایکشن کے بارے میں صرف یہ ظاہری حقیقت بیان کر کے رہ جاتا ہے کہ یہ کیسے ہوا اور کونسی طاقتیں اور کیا کیا آلات و اسلحہ اس میں استعمال کیے گئے، اس کے بعد وہ اس ایکشن سے بچنے کے لیے سطحی تدابیر سوچتا ہے کہ قدرت کے آلات و اسلحہ سے بچاؤ کس طرح کیا جائے۔ وہ کچھ آلات و اسلحہ کا توڑ سوچتا ہے اور اس کے اہتمام پر سالہا سال کی محنتیں اور ملکی دولت کا بڑا حصہ صرف کر دیتا ہے، لیکن قدرت جب دوبارہ حملہ آور ہوتی ہے تو پہلے سے بھاری اسلحہ لاتی ہے اور بالکل نئے اسلوب اور نئے راستوں سے یورش کرتی ہے۔

مادہ پرستی میں گھری ہوئی عقل انسانی حوادث کے پس پردہ کام کرنے والے عذابِ الٰہی کے قانون کو نہیں پا سکتی۔ یہ حقیقت اس کی نگاہ سے ہمیشہ اوجھل رہتی ہے کہ انسانی معاشروں کے لیے کوئی اخلاقی ضابطہ بھی ہے جو خیر و شر کے تمام طبعی و معاشرتی مظاہر کے پیچھے برسرِعمل ہے۔ بھوک، بیماری، قحط، معاشی بے اطمینانی، تفرقہ، غلامی، جنگ، زلزلے، بجلیاں، سیلاب، طوفان، اولے اور نہ جانے کیسے کیسے مہیب عساکر اس گورنمنٹ کے اشاروں پر حرکت کرتے ہیں جو کائنات اور عالمِ انسانی پر اپنا تسلط رکھتی ہے۔ یہ عساکر کبھی سرکشوں کی تادیب و تنبیہ کے لیے دھاوا بولتے ہیں، کبھی باغی اور مفسد سلطنتوں اور قوموں کو قطعی طور پر ملیامیٹ کرنے کے لیے ٹوٹ پڑتے ہیں، اور کبھی ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ ایک قوم میں خشیت، للہیت، احساسِ عجز، دردمندی، رقت اور رجوع الی الحق کے جذبات پیدا کر کے قبولِ ہدایت کی موزوں ذہنی فضا کی تخلیق فرماتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی انسانی گروہ کے اجتماعی کردار کا کسی خاص موقع پر امتحان لے کر اس کے نتیجہ کے مطابق اس کے مستقبل کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔

ہم انبیاء علیہم السلام کی دی ہوئی تعلیم پر ایمان لانے والی قوم ہیں۔ لہٰذا ہمارے سامنے سیلاب کا ہولناک حادثہ صرف طبعی میدان میں یہ سوال پیدا کر کے نہیں رہ جاتا کہ سیلاب کن اسباب کے تحت آیا، آئندہ ایسے حادثوں سے بچنے کے لیے کن تدابیر کو عمل میں لایا جانا چاہیے، اس سیلاب کی

تباہ کاریوں کی تلافی کے لیے کیا منصوبہ تعمیر پیش نظر رکھا جائے اور بجٹ میں اس منصوبے کے مصارف کے لیے کس طرح جگہ نکالی جائے، بلکہ ہمیں کچھ زیادہ تشویش اس امر پر ہونی چاہیے کہ کائنات کے فرماں روا سے بہ حیثیت افراد اور بحیثیت قوم کے ہمارا معاملہ کہیں سرکشی اور انحراف کا تو نہیں ہے جس کی وجہ سے تادیب کے کوڑے پے در پے برس رہے ہیں، اور پھر ہمیں پوری طرح فکرمند ہونا چاہیے کہ اپنا تعلق اپنے رب اور اپنے الٰہ سے از سر نو درست بنیادوں پر استوار کریں۔

اس تشویش اور فکرمندی کے ساتھ اگر ہم اپنا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ ہم مسلمانوں جیسے نام دھرانے کے بعد از سر تا پا ایسی زندگیاں گذار رہے ہیں جن میں مسلمانی کا کوئی پرتو نظر نہیں آتا۔ ہم لا الٰہ الا اللہ پڑھتے ہوئے اپنی خواہشات کو، اپنے خاندانوں اور برادریوں کو، اپنی سیاسی اور مذہبی جتھا بندیوں کو، مختلف لیڈروں اور اکابر کو کھلم کھلا عملی زندگی کے آلہ بنائے ہوئے ہیں۔ ہم محمد صلعم کو خدا کا آخری نبی ماننے کا اعلان کرنے کے بعد زندگی کے لیے ہدایت اور اسوہ اور نمونہ دوسرے دروازوں سے جاکر حاصل کرتے ہیں۔ ہم میں ایک بڑی تعداد اپنے آپ کو مسلمان کہلانے والوں کی ایسی موجود ہے جو خدا کے دین کا مذاق اڑاتے ہیں، اس کے خلاف دن رات حجت بازی میں مصروف رہتے ہیں اور اس کی بیخ کنی کے لیے طرح طرح کے ادارے چلاتے ہیں اور طرح طرح کی سازشیں کرتے ہیں۔ ہمارے اندر بے شمار دیندار لوگ ایسے موجود ہیں جو ایک طرف نماز روزہ ادا کرتے ہیں اور دوسری طرف علانیہ حرام خوری میں مصروف رہتے ہیں۔ متقیانہ اوصاف سے مزین ایسے پیکر پائے جاتے ہیں جو اپنے تقویٰ کو بدترین معصیت کاریوں کے ساتھ ترکیب دے کر خدا اور شیطان دونوں کو بیک وقت راضی رکھنے کی سعی میں مصروف ہیں۔ ہمارے اندر پیروں، مذہبی راہنماؤں، واعظوں اور مفتیوں کا ایک ایسا طبقہ نمایاں طور پر موجود ہے جو ایک طرف بڑی بڑی شاندار خدمات دین سرانجام دیتا ہے اور دوسری طرف اس کی ساری ذہنی اور عملی قوتیں دین کو غالب کرنے کی جدوجہد کو ناکام بنانے میں صرف ہوتی ہیں۔

ہمارے اس پاکستان کے سرمایہ دار اور زمیندار صنعتی اور زرعی محنت کشوں کی جانوں کو ظلم کے کولہو میں پیل پیل کر نفع اندوزی کرتے ہیں۔ ہمارے تاجروں کی اکثریت ایسی ہے جو ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری،

جھوٹ اور وعدہ خلافی، فریب اور عیاری، ناپ تول کی کمی بیشی اور اجناس میں ملاوٹ کے بل پر اپنی کمائیوں میں اضافہ کر رہی ہے۔ ہمارے دفتری عہدہ داروں اور کارندوں کا حال یہ ہے کہ ان میں شاذ ہی ایسے افراد ملیں گے جو خیانت، رشوت، جنبہ داری، سفارش، کنبہ پروری، تضیع اوقات اور کام چوری کی اخلاقی بیماریوں میں ملوث نہ ہوں۔ ہماری معاشرت کے عین سایۂ دیوار میں زنا کے اڈے اور زنا کی تعلیم و ترغیب دینے کے مراکز قائم ہیں اور دلوں کی عصمت اور نگاہوں کی پاکیزگی کم ہی کہیں سلامت رہ گئی ہے۔ جرائم کی کثرت کو دیکھیے تو حال یہ ہے کہ اغوا، جوئے، جیب تراشی، چوری، ڈکیتی، قتل اور فریب دہی وغیرہ کے لیے ہمارا معاشرہ فوجوں کی فوجیں ترتیب دے کر میدان میں اتار رہا ہے۔

پھر ہماری یہ محبوب سرزمین اپنے پردۂ تاریخ پر یہ عبرتناک ڈرامہ بھی پیش کر رہی ہے کہ اس قوم کے دینی حس رکھنے والے لوگ اپنی قوتوں کی پونجی اقامت دین کے کام میں صرف کر رہے ہیں اور مقابلے میں اسی قوم کے ابھارے ہوئے ایک طبقے کے افراد ہیں جو قیادت و اقتدار کی مسندوں پر قابض ہو کر خود اس قوم کے اجتماعی ذرائع و وسائل کو دین کو تباہ کرنے میں جھونک رہے ہیں۔ الحاد اور بے دینی اور بے پردگی کا طوفان اٹھانے میں کوئی کسر نہیں رہنے دی گئی۔ پھر نظربندی، قید، پھانسی، ضبطیٔ املاک، جرمانوں، مقدمہ بازی، اخبارات کی بندش، زبان بندی، دفعہ ۱۴۴ اور دوسرے جابرانہ قوانین کے استعمال سے خدا کے دین کی طرف دعوت دینے والی طاقت کا راستہ روکا جاتا ہے۔ ملک کے سات برس ایک غیر اسلامی دستور کے تحت گذر گئے ہیں اور اس دوران میں ایک اسلامی دستور کی تدوین سے گریز کی ہر تدبیر آزما ڈالی گئی ہے اور اس کام کی تکمیل کو معرضِ التوا میں ڈالنے کے لیے ہر ادنیٰ سے ادنیٰ عذر اور حیلے سے پورا پورا فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

یہ روش مجموعی طور پر اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں انحراف اور سرکشی کی روش ہے۔ خدا کو مان کر اور اس کے دین پر ایمان لانے کا پیمان باندھ کر پھر باغیانہ طرزِ عمل اختیار کرنا ہمیشہ اس کا موجب ہوتا رہا ہے کہ ایک قوم پر غضبِ الٰہی کا سیلاب امڈ پڑے۔

آج جس مصیبت سے ہم دوچار ہیں اس کا تازیانہ لگا کر چاہیے کہ ہماری آنکھیں کھل جائیں اور ہم اپنے طرزِ عمل کا جائزہ لے کر اس میں تبدیلی پیدا کریں۔ خدا کے سامنے اب تک کے کیے پر ندامت کے آنسو بہا کریں اور آئندہ کے لیے بندگی و طاعت کا نیا پیمان استوار کریں۔ ایک طرف افراد اپنی انفرادی زندگیوں کی تعمیرِ نو پر متوجہ ہوں، وہ دین اور کفر، نیکی اور بدی، خیر اور شر، حق اور باطل، حلال اور حرام، تقویٰ اور فسق و فجور میں امتیاز کرنا سیکھیں، وہ عصمت اور فحاشی میں فرق کریں۔ وہ مادہ پرستی اور حق پرستی کے تفاوت کو سمجھیں۔ دوسری طرف اجتماعی زندگی کی بنیادیں اسلامی آئین پر استوار کی جائیں اور ماحول کو انسانیت کی اعلیٰ اخلاقی قدروں کی نشوونما کے لیے سازگار بنانے میں پوری پوری محنت صرف کی جائے۔

پاکستان اس لحاظ سے ایک ایک مسلمان کی امیدوں کا مرکز ہے کہ اس کی فضا میں دعوتِ اسلامی کی اذان کی گونج سنائی دے رہی ہے اور اس کے شہروں اور قریوں میں نظامِ حق کی تحریک موجزن دکھائی دیتی ہے۔ ایسے موقع پر مصائب کی یورش سے جہاں بہت سے نقصانات پہنچتے ہیں وہاں خیر کا ایک پہلو یہ بھی ہوتا ہے کہ دل پگھلتے ہیں، جذبات میں رقت آتی ہے، خدا کی طرف دلوں کا میلان بڑھتا ہے، سچائی کے لیے ذہنوں کے دروازے کھلتے ہیں۔ بسا اوقات کسی کشتی کو مشیت اسی لیے گردابوں میں لا پھنساتی ہے کہ اس کے سواروں کی آنکھوں سے غفلت کے پردے اٹھ جائیں۔ حضرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے ظہور پر بھی ایک موقع ایسا آیا تھا کہ قریش اور آس پاس کے قبائل مشکلات میں گھر گئے۔ یہ معاملہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص نہ تھا بلکہ قرآن مجید نے متعدد مقامات پر اس کی تشریح کی ہے کہ انبیاء کے مخاطبین جب دعوتِ حق کے مقابلے میں سنگ دلی اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اُن کے دلوں کو نرم کرنے کے لیے مصائب بھی نازل فرماتا ہے۔ چنانچہ سورۂ اعراف رکوع ۱۲ میں فرمایا:۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّبِیٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ یَضَّرَّعُوْنَ (اور نہیں بھیجا ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی کہ نہ مبتلا کیا ہو ہم نے انہیں سختی اور تکلیف میں تاکہ وہ گڑگڑائیں۔)

خوش قسمت ہوتی ہے وہ قوم جو نعمت پا کر شکر کا حق ادا نہ کرنے کے بعد کم سے کم مصیبت کے نازل

ہو جانے پر ہوش میں آجائے اور بدنصیب ہے وہ گروہِ انسانی جسے حادثات کے تازیانے بھی خوابِ غفلت سے چونکا نہ سکیں، حتیٰ کہ غضبِ الٰہی کا کوئی آخری ریلا آئے جو اسے ملیا میٹ کر دے۔

نزولِ مصیبت کی صورت میں ایک قوم کے کردار کا بڑا امتحان بھی ہوتا ہے۔ اس طرح کے امتحانات سے گذار کر اسے آگے پیش آنے والے بڑے بڑے معرکوں کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ مشیت یہ جانچنا چاہتی ہے کہ کوئی گروہِ انسانی اپنے اندر عزم و ثبات، نظم و ضبط اور قربانی و ایثار کی کتنی صلاحیتیں رکھتا ہے اور ان صلاحیتوں کو کس پیمانے پر بروئے کار لا سکتا ہے۔ ایک اجتماعی حادثے کے بپا ہو جانے پر کسی ملک کے عام لوگ کیا ردِعمل دکھاتے ہیں، وہ مایوس اور بد دل ہو کر اپنے آپ کو ناساز گار حالات کے قدموں میں ڈال دیتے ہیں یا بقا کے لیے پوری جدوجہد کرتے ہیں، وہ تھڑدلے پن کا ثبوت دیتے ہیں یا ہمت و استقلال کا مظاہرہ کرتے ہیں، وہ نفسا نفسی میں مبتلا ہو جاتے ہیں یا جسمِ واحد بن کر اخوت کے جذبات کو رُو بہ عمل لاتے ہیں اور وہ ہجومِ مشکلات میں فطرت کی پستی کا ثبوت دیتے ہیں یا اپنے کردار میں غیرت و حمیت کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ آبادی کا جو حصہ براہِ راست کسی آفت کا شکار ہوتا ہے وہ کیا طرزِ عمل اختیار کرتا ہے اور جس پر براہِ راست زد نہیں پڑتی وہ کس روش پر چلتا ہے پھر آزمائش اس بات کی بھی ہوتی ہے کہ ملک کی سیاسی اور معاشرتی اور مذہبی تنظیمیں اور ادارے اور طبقات کیا پارٹ ادا کرتے ہیں۔ وہ تعصبات اور اختلافات کی کشمکش کو بدستور جاری رکھتے ہیں یا اپنے بھائیوں کو سہارا دینے کے لیے تعاون اور ہم آہنگی کا ثبوت دیتے ہیں۔ امتحان حکومت کی مشینری اور اس کے پُرزوں اور ڈرائیوروں کا بھی ہوتا ہے کہ وہ ایک ہنگامی صورتِ حالات میں کس درجہ کی زود کاری، یک جہتی، منصوبہ بندی اور کس درجے کے ڈسپلن کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔

ہمارا اندازہ یہ ہے کہ پاکستان پر جو مصیبت ٹوٹ پڑی ہے اس کا ردِعمل دونوں خطوں میں جس طرح سامنے آیا ہے، وہ مایوس کن نہیں بلکہ حوصلہ افزا ہے۔ ہمارے مصیبت زدہ بھائی عزم و حوصلہ کے ساتھ آزمائش کا مقابلہ کر رہے ہیں اور باقی آبادی انفاق اور ایثار اور ہمدردی کے جذبات کا

نہایت اچھا مظاہرہ کر رہی ہے۔ لیکن چونکہ مصیبت کا پیمانہ بہت بڑا ہے، اثرات بڑے دُور رس ہیں اور بہت دیر تک ان زخموں کی چارہ گری کرنی پڑے گی جو اس دوران میں ہماری اقتصادی زندگی کو لگے ہیں، لہٰذا لمبے عرصے تک کام کرنے والے ٹھنڈے جذبات کے ساتھ ابھی ملک کے ایک ایک فرد کو قربانی دینا ہے۔

ملتِ اسلامیہ جن اخلاقی اوصاف کے ساتھ اٹھائی گئی ہے ان میں ایک نمایاں وصف نوعِ انسانی، برادرانِ وطن اور بالخصوص اسلامی برادری کے لیے ہمدردی اور قربانی کا وصف ہے۔ زوال اور انحطاط کے دور میں بھی اس کی قابلِ فخر مثالیں ہماری اگلی پچھلی نسلوں نے پیش کی ہیں۔ اب پھر ایک موقع آیا ہے کہ ہم اپنے ملی کردار کے اس پہلو کو پوری طرح اُجاگر کریں۔ ہم ہر اس تکلیف کو اپنی تکلیف کی طرح محسوس کریں جو ہمارے بھائیوں کو کروڑوں کی تعداد میں درپیش ہے۔ ہم یوں سمجھیں کہ گویا ہم بے گھر ہو کر درختوں سے ٹنگ رہے ہیں، وہ ہم ہی ہیں جو ایک مٹھی اناج کے لیے محتاج ہو گئے ہیں، وہ ہم ہی ہیں جن کے تنوں کی عریانی ایک ایک چیتھڑے کی منت کش ہے، وہ ہم ہی ہیں جن کے بچے موجوں کا لقمہ ہو رہے ہیں، وہ ہم ہی ہیں جو سانپوں اور بچھوؤں کے درمیان گھرے ہوتے ہیں، اور وہ ہم ہی ہیں جن کے سامنے مہلک وبائیں منہ کھولے کھڑی ہیں۔ اس طرح کے گہرے احساسِ اخوت کے ساتھ ہمارا فرض ہے کہ ہم خدا سے مصیبت کے لشکروں کو واپس ٹالنے کی دعائیں بھی کریں اور اپنے بھائیوں کی ایک ایک ضرورت کے لیے جذبۂ انفاق سے پورا پورا کام بھی لیں۔

ہر پاکستانی مسلمان کی طرف سے اسلامی اخوت و ہمدردی کے ایک غیر معمولی عملی مظاہرے کی ضرورت اس لیے بھی بہت زیادہ ہے کہ دونوں خطوں کی دینی و مقصدی اور ملی و سیاسی وحدت کو بعض مفاد پرست عناصر نے جو چرکے جاہلی عصبیتوں کے نعروں سے لگائے ہیں، یہی چیز ان کے لیے مرہم اندمال بن سکتی ہے۔ پارلیمنٹ کی نشستوں کی تقسیم، مرکز اور صوبوں کے اختیارات کی تعیین اور قومی زبان کے مسئلے کو غلط رنگ دے کر مختلف حلقوں میں غیریت اور بیگانگی کے غیر اسلامی رجحانات

پیدا کرنے کی جو افسوسناک کوششیں اب تک ہوتی رہی ہیں ان کے اثرات کو باطل کرنے اور فضا کو ان کے لیے بالکل ناسازگار بنا دینے کے لیے یہ موقع نہایت ہی اہم موقع ہے۔ اس موقع پر اگر ہر صوبہ صحیح اسلامی اخوت کا تحفہ دوسرے صوبے کے سامنے پیش کردے تو دونوں خطوں میں وہ مضبوط جوڑ لگ سکتا ہے جس کے کمزور ہونے کی وجہ سے ہماری سیاسی فضا میں نامطلوب صورت حالات کا طوفان اٹھا۔ یہ موقع ہے اس حقیقت کے واضح کردینے کا کہ پاکستان کی اسلامی مملکت کے پٹھان، پنجابی، سندھی اور بنگالی سب ایک ہیں، مہاجر اور انصار ایک ہیں، سرمایہ دار اور مزدور ایک ہیں لیڈر اور عامی ایک ہیں۔ اور ان سب کو احیائے اسلام کا ایک مقصدِ اعلیٰ باہم دگر ایک ٹیم کی طرح وابستہ کیے ہوئے ہے۔

ایسا مظاہرہ نہ صرف یہ کہ صوبہ پرستوں کے بلند کیے ہوئے نعروں کے زہر سے فضا کو پاک کر سکتا ہے، بلکہ وہ ہمیشہ کے لیے مفاد پرست فتنہ گردوں کے فتنوں کی جڑ کاٹ سکتا ہے۔ یہ بہترین علاج ہے صوبائی اور علاقائی عصبیتوں کا، یہ بہترین مداوا ہے طبقاتی اور گروہی تقسیموں کا، اور یہ بہترین دوا ہے ملک بھر کے اونچے مقاصد سے صرفِ نظر کرکے محدود نسلی اور مقامی مسائل کو اہمیت دینے کی بیماری کا!

ہم اپیل کرتے ہیں کہ اس موقع کو ہماری قوم ضائع نہ کرے!

ان امور کے پیشِ نظر جماعت اسلامی نے اپنا یہ فرض محسوس کیا ہے کہ وہ پورے پاکستان کے سیلاب زدگان کی اعانت کے لیے ایک اجتماعی مہم شروع کرکے حکومت اور دوسرے اداروں کی سرگرمیوں کو مزید تقویت پہنچائے۔

اس جماعت نے اپنے آپ کو کبھی بھی ان سیاست بازگروہوں کی سطح پر نہیں گرنے دیا جن کا کام تمام تر نعروں اور تقریروں اور جلسوں اور جلوسوں پر مشتمل ہوتا ہے اور جو حکومت کے خلاف احتجاج (AGITATION) کرتے رہنے کے سوا اور کوئی تعمیری ذمہ داری قبول نہیں کرتے۔ یہ جماعت

قوم کی سیاسی تربیت و تنظیم کے ساتھ ساتھ اس کے تمام مسائل اور مصائب میں عملاً حصہ دار رہی ہے ۔ جماعت اسلامی کا شعبۂ خدمتِ خلق ایک لاکھ روپے کے سالانہ بجٹ سے معمولی حالات میں بھی معاشرے کی نہایت اہم خدمات انجام دے رہا ہے ۔ کوئی ہنگامی مصیبت آتی ہے تو اول روز سے جماعت ایسے موقعوں پر برادرانِ ملک اور برادرانِ دین کی خدمت کے لیے حکومت اور دوسرے اداروں کے دوش بدوش، بلکہ پیش پیش ہو کر کام کرتی ہے

اس وقت جماعت اسلامی نے سیلاب زدگان کی اعانت کے لیے ایک فنڈ کھول رکھا ہے جس کے واسطے تقریباً ستر ہزار روپیہ مشرقی پاکستان کے سیلاب زدگان کے لیے جمع کیا جا چکا ہے اور اس سے دو چند قیمت کے کپڑے، غذائی سامان اور ادویہ فراہم کی گئی ہیں۔ لہٰذا ان کی ترسیل کا بندوبست کیا جا رہا ہے۔ یہ امداد مشرقی پاکستان کی جماعت اسلامی کے اپنے کارکنوں کے ذریعے مستحقین تک پہنچائی جائے گی۔ اب مشرقی پاکستان کے لیے اعانت فنڈ ختم کر دیا گیا ہے اور یکم اکتوبر سے ساری اعانتیں پنجاب کے لیے فراہم کی جائیں گی ۔

نہ معلوم وہ کیا جذبات ہیں جن کے تحت بعض افراد اور گروہ جماعت کی اس قابلِ قدر خدمت پر بھی برہمی کا اظہار فرما رہے ہیں۔ اس کام میں کیڑے ڈالنے کے لیے سب سے بڑا اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ جب حکومت نے ایک فنڈ کھول دیا تھا اور اعانت کی مہم شروع کر دی تھی تو آخر جماعت اسلامی نے الگ سے کیوں یہ کام شروع کیا۔ ان حضرات کو شاید یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ جماعت اسلامی نے اعانت فنڈ کی اپیل پہلے کی ہے اور حکومت نے بعد میں یہ کام شروع کیا ہے ۔

دنیا بھر کی زندہ و منظم قوموں کا معمول یہی ہے کہ جب کوئی عظیم مصیبت پیش آتی ہے تو حکومت تنہا میدان میں نہیں اترتی بلکہ ساری کی ساری جماعتیں اور ادارات اپنے اپنے نظم کے تحت حرکت میں آجاتے ہیں، کیونکہ ہر جماعت اور ادارے کا اپنا ایک حلقۂ اثر اور ایک حلقۂ اعتماد ہوتا ہے جس کے جذبات اسی کی اپیل اور حرکت پر پوری طرح کام کرتے ہیں۔ کسی معقول معاشرے میں اس طرح کے جذبات کا مظاہرہ نہیں ہوتا کہ جب ہم یا ہماری کوئی معتمد پارٹی کام کر رہی ہے تو کوئی دوسری جماعت کیوں میدان میں آئی کسی تربیت یافتہ

ملت میں یہ حاسدانہ اور نیبانہ نقطۂ نظر نمودار نہیں ہوتا کہ اگر ہمارے کسی محبوب گروہ کے علاوہ عوام کی خدمت کسی اور نے بھی انجام دی تو وہ قبولیت و اعتماد کی فصل میں سے حصہ لے اُڑے گا۔ ایسے نازک موقعوں پر ایسی گھٹیا ذہنیت پیش کرنے کے بجائے ہوتا یہ ہے کہ معاشرے کی تمام منظم طاقتیں کمربستہ ہو کر سرگرم عمل ہو جاتی ہیں۔ مصیبت زدوں کی اعانت میں سرمایہ لگا کر اثر و رسوخ کا منافع حاصل کرنا اگر کسی کا مطمح نظر ہو، اور اگر کوئی جماعت ہنگامی حالات میں بھی اپنی "واحد نمائندگی" کا منصب حاصل کرنے کے درپے ہو تو درحقیقت اس سے ذلیل کوئی ذہنیت نہیں ہو سکتی۔

اظہارِ فخر کے طور پر نہیں بلکہ تحدیثِ نعمت اور بیانِ واقعہ کے طور پر یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ جماعت اسلامی نے قومی مصائب و حوادث کے مختلف مواقع پر جو خدمت بھی سرانجام دی ہے، گو وہ کتنی ہی حقیر ہو لیکن بعض پہلوؤں سے ویسی خدمت عمالِ حکومت یا عوامی کارکن کبھی سرانجام نہیں دے سکے۔ اِن امدادی مہمات میں جماعت سے تعاون کرنے والے بہت سے اصحاب نے ہمارے کارکنوں سے یہ کہا ہے کہ اگر آپ لوگ ہمارے پاس نہ آتے تو ہمیں کچھ دینے میں بہت تأمل ہوتا۔ رقوم و اشیاء کی فراہمی کے بعد جب ان کی تقسیم کا مرحلہ آتا ہے تو اُس وقت بھی ہم ایسے مستحقین کو مدد پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں جن کا احتیاج سب سے زیادہ شدید ہوتا ہے لیکن جن کی حالتِ زار پر توجہ دینے والا کوئی بھی نہیں ہوتا۔ چنانچہ اس وقت بھی مشرقی پاکستان میں ہمارے رفقاء اپنی جانوں پر کھیل کر ایسے ایسے دُور افتادہ مقامات تک مدد پہنچا رہے ہیں، جہاں تک جانے کا ارادہ یا جرأت و ہمت کسی دوسرے میں نہیں ہے۔

پھر ہمارے کارکن اِن حادثات میں ایسے کاموں کو بھی پوری تندہی اور جانفشانی سے کرتے ہیں جن کاموں کو دوسرے لوگ اپنے مرتبے سے فروتر سمجھتے ہیں۔ ہمارے ساتھی متعفن بدروؤں اور غلاظت کے ڈھیروں کو اپنے ہاتھ سے صاف کرتے ہیں، سڑی ہوئی میتوں کی تغسیل و تکفین کرتے ہیں، نمازِ جنازہ پڑھتے ہیں اور خود قبر کھود کر اپنے بھائیوں کو اُن کی آخری آرامگاہ تک پہنچاتے ہیں۔

جماعت اسلامی مصیبت زدوں کی خدمت محض ایک دینی و اخلاقی فرض کی حیثیت سے ادا کرنا چاہتی ہے اور اس سے اُس کا مقصود رضائے الٰہی کے حصول کے سوا اور کچھ نہیں!

اس جماعت کے پیش نظر ایک اور اہم مقصد بھی ہے جس کے لیے وہ مختلف ہنگامی مواقع پر اپنے نظم کے تحت باشندگان ملک کی خدمات انجام دیتی ہے۔ وہ اہم مقصد اپنے کارکنوں اور ملکی اور دینی بھائیوں کی ذہنی و اخلاقی تربیت ہے۔

جماعت اسلامی لوگوں میں یہ اسپرٹ پیدا کرنا چاہتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول اور اس کے دین کی خدمت اور اس کے بندوں کی اعانت کے لیے ٹھیک اسلامی جذبات کے ساتھ انفاق کرنا سیکھیں۔ ہمارے ہاں انفاق ہوتا ہے مگر بالعموم اس طرح ہوتا ہے کہ کہیں شہرت و نمود کے جذبہ کی تسکین کا سامان کیا جاتا ہے، کہیں ملک کے وزرا اور عہدہ داروں کی خوشنودی کا حصول مدنظر ہوتا ہے تاکہ ان کی اپیل پر لبیک کہہ کر یا اس کے سامنے چندہ کی تھیلیاں پیش کرکے بعد میں ان کی خوشنودی سے فوائد حاصل کیے جاسکیں، کہیں کھیل[1]، ڈراموں اور مشاعروں کی لذت تفریح کی قیمت کے طور پر چند سکے جیبوں سے نکالے جاتے ہیں۔ جماعت اسلامی اس کوشش میں ہے کہ لوگ نام و نمود، اثر و رسوخ اور مادی فوائد کے حصول سے بے نیاز ہوکر محض اللہ کی خوشنودی کے لیے اپنا مال صرف کرنے کی خصلت پیدا کریں۔

پھر جماعت اسلامی قوم کے کیرکٹر کو اس پہلو سے بھی تیار کرنا چاہتی ہے کہ قوم کی اجتماعی ضرورت کے فنڈز جب کچھ ہاتھوں میں بطور امانت سونپے جائیں تو وہ ہر خیانت سے محفوظ ٹھیک اس مصرف پر جاکے صرف ہوں جس کے لیے وہ سونپے گئے تھے۔

پھر وہ یہ بھی چاہتی ہے کہ مصیبت کا مقابلہ کرنے کے لیے زر قوم اعانت کے حصول اور ان کو صحیح مصرف تک پہنچانے کا سارا کام ضبط و نظم اور سرعت رفتار کے ساتھ سرانجام پائے۔

پاکستان کے اجتماعی کیرکٹر کو اسلامی اصولوں پر استوار کرنے کا یہ کام پوری اہمیت کے ساتھ کرنے والی کوئی دوسری طاقت موجود نہیں ہے۔ مختلف جماعتیں اور ادارے اور سب سے بڑھ کر حکومت اور اس کے مختلف محکمے اگرچہ فنڈز کی بہت بڑی مقدار سیلاب زدگان کے لیے فراہم کریں گے اور مصیبت زدگان کی بے شمار

[1] لاہور اور کراچی میں چندہ حاصل کرنے کے لیے فلمی تماشوں یعنی ایکٹریوں اور ایکٹرسوں کے کرکٹ میچ کا انتظام کیا جارہا ہے۔ بعض مقامات پر ناچ اور گانے کی مجالس اسی مقصد سے منعقد کی جارہی ہیں۔

ضروریات ان کے ہاتھوں پوری ہو سکیں گی، لیکن اعانت کے کام کے ساتھ ساتھ قومی اخلاق کی تعمیر اور اجتماعی ذہن کی اسلامی تربیت کا اہتمام کرنا کسی کے مدِنظر نہیں ہے۔ یہی وہ اہم پہلو ہے جس کا لحاظ کرتے ہوئے جماعت نے مختلف مواقع پر اپنے نظم کے تحت قوم کی خدمات انجام دی ہیں۔

عقیدۂ ختمِ نبوت کے چند عمرانی پہلو

عبد الحمید

اسلامی تصورِ حیات میں توحید کے بعد سب سے بڑی اہمیت عقیدۂ ختم نبوت کو حاصل ہے بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہی وہ اصل بنیاد ہے جس کی وجہ سے اسلام دوسرے الہامی مذاہب سے ممیز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کسی گذشتہ پیغام کے متعلق یہ نہیں فرمایا کہ اس کی تکمیل ہو چکی ہے، اور اس کی حفاظت کا میں ذمہ دار ہوں سو دنیا کے تمام وہ صحائف جو گم ہو چکے ہیں، ان کا گم ہو جانا ہی ان کے وقتی اور عارضی ہونے کی ایک بیّن دلیل ہے اور جو موجود ہیں ان کی ایک ایک آیت تلاش کیجیے، آپ کہیں بھی ان میں اپنی تکمیل اور حفاظت کے وعدہ کے متعلق ایک خفیف سے خفیف اشارہ تک نہ پائیں گے بلکہ اس کے برعکس ایک آنے والے نبی کی عالمگیر اور دائمی تعلیم، اور اس تعلیم کے عملی نمونہ کے متعلق آپ کو جا بجا تصریحات ملیں گی۔ مثال کے طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں:

"خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا۔ تم اُس کی سننا۔ یہ تیری اُس درخواست کے مطابق ہوگا جو تُو نے خداوند اپنے خدا سے مجمع کے دن حورب میں کی تھی کہ مجھ کو نہ خداوند اپنے خدا کی آواز پھر سننی پڑے اور نہ ہی ایسی بڑی آگ ہی کا نظارہ ہو تاکہ میں مر نہ جاؤں"۔ (استثنا ۱۸: ۱۵، ۱۶)

"اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سو ٹھیک کہتے ہیں میں اُن کے لیے اُن کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اُس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اُسے حکم دوں گا وہی اُن سے کہے گا اور جو کوئی میری اُن باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سُنے تو میں اُن کا حساب اُس سے لوں گا" (۱۸: ۱۸، ۱۹)

"اور مردِ خدا موسیٰ نے جو دعائے خیر دے کر اپنی وفات سے پہلے بنی اسرائیل کو برکت

دی وہ یہ ہے۔ اور اُس نے کہا

خداوند سینا سے آیا

اور شعیر سے اُن پر آشکارا ہوا۔

وہ کوہ فاران سے جلوہ گر ہوا

اور لاکھوں قدسیوں میں سے آیا

اُس کے داہنے ہاتھ پر اُن کے لیے آتشیں شریعت ہوگی (استثناء۔۳۳-۲)

تورات ان مذکورہ بالا آیتوں میں صاف طور پر بتا رہی ہے کہ ایک اور نبی موسیٰ علیہ السلام کے مثل اس دنیا میں تشریف لانے والے ہیں جو اپنے ساتھ ایک اور آتشین شریعت بھی لائیں گے اور اُن کے مُنہ میں خدا اپنا کلام بھی ڈالے گا۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ حضرت موسیٰ کا پیغام آخری نہیں ہے اور اس لحاظ سے اُن کا نمونہ بھی دائمی نہیں۔

اس کے بعد یسعیاہ نبی ایک اور رسول کی خوشخبری سناتے ہیں:۔

"اے صیون کو خوشخبری سُنانے والی اونچے پہاڑ پر چڑھ جا اور اے یروشلم کو بشارت دینے والی زور سے اپنی آواز بلند کر خوب پکار اور مت ڈر۔ یہوواہ کی بستیوں سے کہہ دیکھو اپنا خدا دیکھو خداوند خدا بڑی قدرت کے ساتھ آئے گا اور اُس کا بازو اس کے لیے سلطنت کریگا۔ دیکھو اُس کا صلہ اُس کے ساتھ ہے اور اُس کا اجر اُس کے سامنے۔ وہ چوپان کی مانند اپنا گلہ چرائے گا۔ وہ برّوں کو اپنے بازوؤں میں جمع کرے گا اور اپنی بغل میں لے کر چلے گا اور اُن کو جو دودھ پلاتی ہیں آہستہ آہستہ لے جائیگا"

(یسعیاہ۔ ۴۰۔ ۹،۱۰،۱۱)

انبیائے بنی اسرائیل کے دیگر صحائف اور زبور میں بھی آئندہ آنے والوں کی بشارتیں ہیں۔ ان سے ثابت ہوتا ہے کہ ان میں سے کسی بھی نبی کا پیغام اور اُس کی اپنی زندگی بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے واجب الاطاعت نہیں۔

انجیل کو دیکھیے وہ اعلان کرتی ہے:۔

"میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو مجھ پر ایمان رکھتا ہے یہ کام جو میں کرتا ہوں وہ بھی کرے گا بلکہ

ان سے بڑے کام کرنے گا۔ کیونکہ میں باپ کے پاس جاتا ہوں اور جو کچھ تم میرے نام سے چاہو گے میں وہی کروں گا۔ اگر تم مجھ سے محبت رکھتے ہو تو میرے حکموں پر عمل کرو گے اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے۔" یوحنا ۱۴ : ۱۲-۱۶)

"میں نے یہ باتیں تمہارے ساتھ رہ کر تم سے کہیں۔ لیکن مددگار یعنی روح القدس جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا وہی تمہیں سب باتیں سکھائے گا اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ سب تمہیں یاد دلائے گا۔ میں تمہیں اطمینان دے جاتا ہوں۔ اپنا اطمینان تمہیں دیتا ہوں۔ جس طرح دنیا دیتی ہے میں تمہیں اس طرح نہیں دیتا۔ تمہارا دل نہ گھبرائے اور نہ ڈرے۔" (یوحنا ۱۴ : ۲۶)

"لیکن میں نے یہ باتیں اس لیے تم سے کہیں کہ جب ان کا وقت آئے تو تم کو یاد آجائے کہ میں نے تم سے کہہ دیا تھا اور میں نے شروع میں تم سے یہ باتیں اس لیے نہ کہیں کہ میں تمہارے ساتھ تھا۔ مگر اب میں اپنے بھیجنے والے کے پاس جاتا ہوں اور تم میں سے کوئی مجھ سے نہیں پوچھتا کہ تو کہاں جاتا ہے۔ بلکہ اس لیے کہ میں نے یہ باتیں تم سے کہیں۔ تمہارا دل غم سے بھر گیا۔ لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا۔ اور وہ آکر دنیا کو گناہ اور راستبازی اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے گا۔ گناہ کے بارے میں اس لیے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لاتے۔ راستبازی کے بارے میں اس لیے کہ میں باپ کے پاس جاتا ہوں اور تم مجھے پھر نہ دیکھو گے۔ عدالت کے بارے میں اس لیے کہ دنیا کا سردار مجرم ٹھہرایا گیا ہے۔ مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہے مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے لیکن جب وہ یعنی روح حق آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔ اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہیگا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا (یوحنا ۱۶ : ۲-۱۵)

ان آیات میں انجیل نے صاف اعلان کیا ہے کہ خود انجیل خدا کا آخری کلام نہیں اور اس وجہ سے اس کا پیش کرنے والا بھی وہ آخری انسان نہیں جس کا ہر فعل اور قول قیامت تک لوگوں کے لیے نجات

کی آخری اور واحد سند ہو۔ مسیح علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ ایک اور آنے گا جو اس کے پیغام کی تکمیل کریگا مگر محمد رسول اللہ کا پیغام اپنے بعد کسی اور آنے والے کا پیغام نہیں دیتا۔ خداوند تعالیٰ نے جس طرح دین کے متعلق اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے) ارشاد فرمایا ہے بالکل اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی کہا ہے :۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ۔ (احزاب ۵)

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں مگر وہ اللہ کے رسول اور نبیوں (کے سلسلے) کو ختم کرنے والے ہیں۔

حضور سرورِ دو عالم نے اسی مضمون کی کئی طریقوں سے صراحت فرمائی ہے۔ مثال کے طور پر ہم یہاں چند احادیث نقل کرتے ہیں :۔

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم کانت بنو اسرائیل تسوسھم الانبیاء کلما ھلک نبی خلفہ نبی وانہ لا نبی بعدی وسیکون خلفاء (بخاری)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بنی اسرائیل کا حال یہ تھا کہ ان کی قیادت انبیا کیا کرتے تھے جب کوئی نبی مر جاتا تو دوسرا نبی اس کی جانشینی کرتا مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے بلکہ خلفا ہوں گے۔

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان مثلی و مثل الانبیاء من قبلی کمثل رجل بنی بیتا فاحسنہ واجملہ الا موضع لبنۃ من زاویۃ فجعل الناس یطوفون بہ ویعجبون لہ ویقولون ھلا وضعت ھذہ اللبنۃ قال فانا اللبنۃ وانا خاتم النبیین۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری اور مجھ سے پہلے گذرے ہوئے انبیاء کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے ایک عمارت بنائی اور خوب حسین و جمیل بنائی مگر ایک کونے میں اینٹ کی جگہ چھوڑ دی۔ لوگ اس عمارت کے گرد پھرتے اور اس کی خوبی پر اظہار حیرت کرتے تھے، مگر کہتے تھے کہ اس اینٹ کی جگہ پر کیوں نہ کر دی گئی اور وہ اینٹ میں

ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں ۔

عن عبد الرحمٰن بن جُبَیر قال سمعت عبد اللہ بن عمرو یقول خرج علینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوماً کالمودع فقال انا محمد النبی الامی ثلاثا ولا نبی بعدی ۔ (مسند احمد)

عبد الرحمٰن بن جبیر کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبد اللہ بن عمرو کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مکان سے نکل کر ہمارے سامنے تشریف لائے اور اس انداز سے کہ گویا آپ ہم سے رخصت ہو رہے ہیں یہ فرمایا "میں محمد نبی امی ہوں (تین بار یہ فقرہ آپ نے دہرایا) اور میرے بعد کوئی نبی نہیں"

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا نبی بعدی ولا امۃ بعد امتی ۔ (بیہقی)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں اور میری امت کے بعد کوئی امت (یعنی کسی نبی کی امت) نہیں ۔

یہ عقیدہ اسلام میں اس قدر بنیادی اہمیت رکھتا ہے کہ علماء امت نے کسی مدعیِ نبوت سے دلیلِ نبوت کے مطالبہ کو بھی کفر سے تعبیر کیا ہے ۔ چنانچہ امام ابو حنیفہؒ کے زمانے میں ایک مدعی نبوت نے جب نبوت کا دعویٰ کیا اور کہا کہ مجھے موقع دو کہ میں اپنی نبوت کے دلائل پیش کر سکوں تو اس پر فلسفۂ تشریع اسلام کے اس رمز شناس نے یہ قانونی حکم (RULING) دیا :

من طلب منہ علامۃ فقد کفر لقولہ علیہ السلام لا نبی بعدی

جو شخص اس سے کسی علامت کا مطالبہ کریگا وہ بھی کافر ہو جائے گا ، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرما چکے ہیں کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ۔

اسی طرح حجۃ الاسلام امام غزالیؒ نے اس کی اہمیت کا یوں اظہار کیا ہے :۔

ان الامۃ فھمت بالاجماع من ھذا اللفظ انہ افھم عدم نبی بعدہ ابدا وعدم رسول بعدہ ابداً وانہ لیس فیہ تاویل ولا

امت نے اس لفظ (لا نبی بعدی) سے یہ سمجھا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتا دیا ہے کہ آپ کے بعد کبھی نہ کوئی نبی آئے گا اور نہ رسول ۔ اور یہ کہ اس میں کسی تاویل کی

تخصیص ومن اوله تخصیص فکلامه من انواع الهذیان لا یمنع الحکم بتکفیره لانه مکذب لهذا النص الذی اجمعت الامة علی انه غیر ماول ولا مخصوص

تخصیص کی گنجائش نہیں ہے۔ جو شخص اس کی تاویل کرکے اسے کسی خاص معنی کے ساتھ مخصوص کرے اس کا کلام ہذیان ہے اور یہ تاویل اس پر تکفیر کا حکم لگانے میں مانع نہیں ہے۔ کیونکہ وہ اس نص کو جھٹلا رہا ہے جس کے متعلق تمام امت کا اجماع ہے کہ اس کی تاویل و تخصیص نہیں کی جا سکتی۔

یہ سب تصریحات اس حقیقت کو ثابت کرتی ہیں کہ سلطانِ کائنات کی طرف سے روئے زمین پر بسنے والے انسانوں کو جس آخری نبی کے ذریعہ سے مستند ہدایت نامہ اور ضابطۂ قانون بھیجا گیا اور جس کو اس ضابطہ کے مطابق کام کرکے ایک مکمل نمونہ قائم کر دینے پر مامور کیا گیا وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔ چنانچہ قرآن ارشاد فرماتا ہے:۔

قل یایها الناس انی رسول الله الیکم جمیعا الذی له ملک السموات والارض لا اله الا هو یحیی ویمیت۔ فامنوا بالله ورسوله النبی الامی الذی یومن بالله وکلمته واتبعوه لعلکم تهتدون۔

کہہ دے اے بنی نوع انسان! میں تم سب کی طرف اس اللہ کا رسول ہوں جس کے لیے آسمانوں اور زمین کی سلطنت ہے۔ جس کے سوا کوئی خدا نہیں جو مارنے اور جلانے والا ہے۔ پس ایمان لاؤ خدا پر اور اس کے رسول نبی امی پر جو اللہ اور اس کے فرامین پر ایمان رکھتا ہے اور اس کی پیروی کرو۔ امید ہے تم راہ راست پاؤ

وما ارسلنک الا کافة للناس بشیرا ونذیرا ولکن اکثر الناس لا یعلمون

(السبا-۳)

اے محمد! ہم نے تمہیں تمام انسانوں کے لیے ڈرانے والا اور بشارت دینے والا بنا کر بھیجا ہے مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔

وارسلنک للناس رسولا وکفی بالله شهیدا (النساء-۱)

(اے محمد) ہم نے تمہیں لوگوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے اور اس پر خدا کی گواہی کافی ہے۔

معاملہ پھر یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ انسانوں پر یہ حقیقت بھی پوری طرح واضح کر دی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مقدس ہی وہ کامل نمونہ ہے جس کی پیروی تمہارے ایمان کی اولین شرط ہے اور جس کی غیر مشروط اطاعت پر تمہاری دنیوی فلاح اور اُخروی نجات کا انحصار ہے :-

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجو اللہ والیوم الاخر و ذکر اللہ کثیراً

تمہارے لیے رسولِ خدا میں ایک اچھا نمونہ ہے اس کے لیے جو امید رکھتا ہے اللہ کی اور یوم آخرت کی اور جو اللہ کو بہت زیادہ یاد کرتا ہے ۔

اس آیت میں حق تعالیٰ نے زندگی کے ہر ہر مرحلہ میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلنے کا حکم دیا ہے اور فرمایا ہے کہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان اس امر کا متقاضی ہے کہ حضور سرورِ دوعالم کی بلا چون و چرا پیروی کی جائے ۔ چنانچہ قرآنِ حکیم میں بار بار اس کی تاکید کی گئی ہے :-

من یُطع الرسول فقد اطاع اللہ (النساء)

جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی ۔

انما کان قول المومنین اذا دُعُوا الی اللہ و رسولہ لیحکم بینھم ان یقولوا سمعنا و اطعنا واولئک ھم المفلحون . . . . وان تطیعوہ تھتدوا (النور : ۷)

اہلِ ایمان کا کام تو یہ ہے کہ جب اُن کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جائے تاکہ (رسول) ان کے درمیان فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سُنا اور مان لیا ۔ ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں . . . . . اور اگر تم اس کی (یعنی رسول کی) اطاعت کرو گے تو ہدایت پاؤ گے

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجاً مما قضیت ویسلموا تسلیماً (النساء ۹)

پس قسم ہے تیرے پروردگار کی نہیں! وہ ہرگز مومن نہیں جب تک کہ وہ اپنے آپس کے جھگڑے میں تجھ کو فیصلہ کرنے والا نہ بنائیں ۔ پھر تو جو کچھ فیصلہ کرے اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی بھی نہ پائیں بلکہ سربسر تسلیم کریں ۔

وما کان لمومنٍ ولا مومنۃٍ اذا قضی اللہ

کسی مومن یا مومنہ کو یہ حق نہیں کہ جب اللہ اور اس کا

ورسولہٗ امرًا ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم ومن یعص اللہ ورسولہٗ فقد ضلّ ضلالًا مبینًا (احزاب - ۵)	رسول کسی بات کا فیصلہ کر دے تو ان کے لیے اپنے معاملہ میں خود کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار باقی رہے اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ کھلی گمراہی میں پڑ گیا۔
وما اٰتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا۔	رسول جو کچھ (حکم) تمہیں دے اُسے تھام لو اور جس سے تمہیں روکے، رُک جاؤ۔
ویقولون اٰمنا باللہ وبالرسول و اطعنا ثم یتولّٰی فریق منھم من بعد ذالک وما اولٰئک بالمؤمنین واذا دعوا الی اللہ ورسولہ لیحکم بینھم اذ فریق منھم معرضون (النور - ۷،۴)	اور کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور رسول پر ایمان لائے اور ہم نے اطاعت کی۔ پھر اُن میں سے ایک گروہ اُس کے بعد مُنہ پھیرتا ہے اور یہ لوگ مومن نہیں ہیں اور جب وہ اللہ اور اُس کے رسول کی طرف بلائے جاتے ہیں تاکہ وہ (رسول) اُن کے مابین فیصلہ کرے، تو اُس وقت اُن میں سے ایک گروہ روگردانی کرتا ہے۔

حضورؐ نے اس آیت کی اس طرح ترجمانی فرمائی ہے:۔

من اطاع محمدا فقد اطاع اللہ و من عصیٰ محمد فقد عصیٰ اللہ ومحمد فرق بین الناس	جس نے محمدؐ کی اطاعت کی اُس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے محمدؐ کی نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ اللہ کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کے درمیان محمدؐ ہی نشانِ امتیاز ہیں۔

ان آیات سے یہ حقیقت خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ حضور سرورِ دو عالم کی مستقل بالذات پیشوائی و رہنمائی تسلیم کرنے پر ہی ایمان کا انحصار ہے۔ اس لحاظ سے ہر دوسرے انسان کی اطاعت سنتِ رسول اللہ کے تحت ہو گی نہ کہ ان سے آزاد ہو کر۔ حضورؐ ہی وہ واحد معیارِ حق ہیں، جو ہر تنقید سے بالاتر ہیں اور اس بنا پر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ ہر ایک کو انہی کے معیارِ کامل پر جانچے اور

پرکھے اور جو اس معیار کے لحاظ سے جس درجہ میں ہو، اس کو اسی درجہ میں رکھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضور خداوند تعالیٰ کے منشا کے آخری نمائندے ہیں۔ انہیں اس بات پر مامور کیا گیا ہے کہ وہ خالق کائنات کی پسند و ناپسند کو قیامت تک دنیا کے لیے واضح فرما دیں۔ اس کے امامر اور نواہی کی قطعی تعبیر و تفصیل پیش کر دیں اور بنائے ہوئے اصولوں کو عملی حالات پر منطبق کر کے بتا دیں کہ یہ ان کی آخری شکل ہے۔

ایمان باللہ کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے لیے ایک خالق، ایک رب، ایک آقا، ایک ہادی اور ایک قانون ساز کا وجود تسلیم کرے، اس کے سامنے جوابدہی اور ذمہ داری کو محسوس کرے اور اس کی پسند کو اختیار کرنے اور اس کی ناپسند سے بچنے کی فکر کرے، مگر وہ ذات مقدس، وہ بزرگ و برتر وجود جس کی وجہ سے انسانوں کو یہ سعادت نصیب ہوئی اور جب تک کائنات قائم ہے نصیب ہوتی رہے گی وہ حضور سرور دو عالم کی ذات با برکات ہے۔ لہٰذا اُن پر ایمان لانے اور بلا تامل اطاعت کرنے میں ہی انسان کی راہِ نجات ہے۔ صحیح مسلم میں آپ کا وہ خطبہ مذکور ہے جو اس حقیقت کی ترجمانی کرتا ہے۔

اما بعد فان خیر الحدیث کتاب اللہ وخیر الھدی ھدی محمد وشر الامور محدثاتھا وکل بدعۃ ضلالۃ	(حمد الٰہی کے بعد) بہترین کلام خدا کا کلام ہے بہترین طریقہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے۔ بدترین امور نئی باتیں ہیں اور ہر نئی بات گمراہی ہے۔

مسند احمد، ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ میں ہے:۔

علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین تمسکوا بھا وعضوا علیھا بالنواجذ وایاکم ومحدثات الامور فان کل محدثۃ بدعۃ وکل بدعۃ ضلالۃ۔	میرا طریقہ اور میرے ہدایت یافتہ جانشینوں کا طریقہ اختیار کرو، اس کو اچھی طرح پکڑے رہو، اور اس کو دانت سے دبائے رکھو، ہاں نئی باتوں سے بچنا، ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

حضور رسالتمآب کا یہ ارشاد آپ کے خاتم النبیین ہونے کا فطری اقتضا ہے۔ کیونکہ انہی کی ذات سے حکمت ربانی اور معرفت الٰہی کے سارے چشمے پھوٹتے ہیں اور ابد تک طالبان راہ حق کے لیے فیض ربانی کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ اُن کی ذات سے منہ موڑ کر اور ان کے طریقہ کو چھوڑ کر کوئی شخص راہِ ہدایت نہیں

پاسکتا تمام اطاعتیں اُن کی اطاعت کے ماتحت اور اُن کی اطاعت سے مشروط ہیں۔ ماں، باپ، استاد، مرشد، حاکم، غرض جو کوئی بھی ہو اس کی اطاعت حضورؐ کی اطاعت کی تابع ہوگی۔ جو اُن کی اطاعت سے آزاد ہے، اُس کی اطاعت سے بندگانِ خدا آزاد ہیں ؎

بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی ست

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ سب عقیدۂ ختم نبوت کے طبعی اور لازمی مقتضیات ہیں۔ دینِ اسلام میں یہ عقیدہ محض ایک مابعد الطبیعی تصور کی حیثیت سے شامل نہیں بلکہ اسلامی تہذیب و تمدن کی تشکیل میں اُس نے نہایت اہم حصہ ادا کیا ہے۔ علامہ اقبال مرحوم نے اپنی تصنیف " اسلامی الٰہیات کی تشکیلِ جدید" میں اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"اس تصور کی عقلی اہمیت یہ ہے کہ اس سے باطنی تجربے کی نسبت ایک تنقیدی روش پیدا ہو جاتی ہے جو یہ تعلیم دیتی ہے کہ ہر قسم کا شخصی اقتدار جو فوق الفطرت بنیاد پر قائم ہونے کا مدعی ہو تاریخِ انسانی میں ختم ہو گیا ہے۔ اس قسم کا عقیدہ ایک نفسیاتی قوت ہے جو اس طرح کے فوق الفطری اقتدار کی نفی کرتی ہے۔"

مسلمانوں کے تہذیبی ارتقاء میں ایک چیز جو سب سے نمایاں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے باوجود اپنی بے عملی کے قرآن اور سنت کو اپنا آخری راہنما اور ثالث تسلیم کیا اور اس بات کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے کہ اسی کی روشنی میں اپنا زندگی کا سفر جاری رکھیں۔ انہوں نے بلاشبہ قرآن و سنت کے بعض جزوی مسائل میں اختلاف بھی کیا مگر اس بات کو کبھی گوارا نہ کیا کہ ان سے ہٹ کر کسی اور کو حق و باطل کی میزان لیا جائے۔ جو چیز بھی سامنے آئی انہوں نے اُس کا تنقیدی جائزہ لیا اور اسی ایک معیار پر کھوٹے سے کھرے کو الگ کرتے رہے۔

دنیا میں یہ شروع ہی سے ہوتا چلا آ رہا ہے کہ انسانوں نے اپنی قوتِ تنقید کا سارا زور خارجی تجربہ پر صرف کیا اور باطنی تجربہ، خواہ کتنا ہی گمراہ کن اور باطل کیوں نہ ہو اس کی زد سے محفوظ رہا۔ اس

نے انسانوں کے اندر طرح طرح کی گمراہیاں پروان چڑھیں۔ تھیاکریسی کا تصور بھی اسی کا ایک شاخسانہ ہے۔
حضور چونکہ وہ آخری انسان ہیں جنہیں خدا نے نبوت سے سرفراز فرمایا، اس لیے خدا تعالیٰ نے نوع انسانی
کو ہر قسم کے فتنے سے محفوظ کرنے کے لیے اپنی کتاب میں اس امر کی صاف طور پر ہدایت فرما دی۔

ولئن اتبعت اھواءھم بعد الذی	اور اگر تم نے اس العلم کے بعد جو تمہارے پاس اللہ کی
جاءك من العلم مالك من اللہ من ولی	طرف سے آیا ہے ان کی خواہشوں کی پیروی کی تو اللہ
ولا نصیر۔ (البقرہ۔ ۱۲۰)	کے مقابل میں تمہارا کوئی کارساز اور مددگار نہ ہو گا۔
ولئن اتبعت اھواءھم من بعد ما	اور اگر تم ان کی خواہشوں کی پیروی کرو گے بعد اس کے کہ
جاءك من العلم انك اذاً لمن الظٰلمین	تمہارے پاس العلم آچکا ہے تو تم اس وقت ظالموں
(البقرہ رکوع ۱۷)	میں سے ہو گے۔

اس بات کی صراحت حضور سرورِ دو عالم نے یوں فرمائی ہے:۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے تم میں دو
ترکت فیکم امرین لن تضلوا ما تمسکتم	چیزیں چھوڑی ہیں یعنی کتاب اور سنت۔ جب تک
بھما کتاب اللہ وسنۃ رسولہ	ان دونوں پر مضبوطی سے قائم رہو گے اس وقت تک
(مشکوٰۃ)	تم گمراہ نہ ہو گے۔

لہٰذا اسلامی تہذیب کی تشکیل اُن معروضی اقدار پر کی گئی ہے جن کو خداوند تعالیٰ نے نبی آخر الزماں کے
ذریعہ اہلِ دنیا پر نازل فرمایا اور ان پر یہ فرض عائد کیا کہ وہ ہر تجربہ اور مشاہدہ کو خواہ وہ خارجی ہو یا داخلی
انہی ایک معیار پر پرکھ کر دیکھیں۔ اگر وہ اس پر پورا اترتا ہو تو اُسے قبول کریں ورنہ بغیر تامل کے رد کر دیں
ایک مسلمان کو اب اس امر کا پورا یقین ہے کہ کوئی "کلیم" طور کی چوٹی پر جا کر اُسے کسی نئی "الہامی قدر" سے
شناسا نہیں کر سکتا بلکہ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد اُس کا صرف یہی
فرض ہے کہ "فاران کی چوٹیوں" سے پکارنے والے ہادیِ برحق نے جو کچھ کہا ہے اُس پر بلا تامل عمل کرے
اس امر میں امت کے سارے علماء، صلحاؒ اور متکلمین متفق ہیں۔ اس طرزِ عمل نے ملتِ اسلامیہ کے

لے شیخ علی بن عثمان ہجویریؒ اپنی تالیف کشف المحجوب میں فرماتے ہیں:۔ (باقی ص ۴۸ پر)

مختلف عناصر کو باہمی مؤدت اور اخوت کے ان مضبوط رشتوں میں منسلک کر دیا ہے جو وقتی مفادات یا اشتراکِ نسل و وطن سے کہیں زیادہ پائیدار ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) "ہر کہ خلق را دعوت کند بامرے از حق مرآں را برہانے باید؛ برہان آں حفظ سنت باشد، چوں از تو ترک فریضہ بینیم و تو خلق را بداں دعوت می کنی ایں کار از دائرۂ اسلام بیروں می باشد۔

جو شخص خلق کے سامنے دعوتِ حق لے کر آنے کا مدعی ہوتا ہے اُسے اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی دلیل بھی لانا چاہیے اور یہ دلیل سنتِ رسول کی پابندی ہے تم دعوتِ حق کے مدعی ہو، مگر جب تم نے ترکِ فریضہ کر دیا تو یہ فعل دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔

آنکہ طریقش ترک باشد و خلافِ شریعت چیزے بردست گیرد و گوید کہ من طریقِ ملامت می سپرم، آں ضلالت واضح باشد و آفت ظاہر و ہوس صادق چنانچہ اندریں زمانہ بسیارے مستند کہ مقصود شاں از رد خلق قبول ایشاں بود

تو جو کوئی اس طریق ترک کو اختیار کرتا ہے اور کسی خلافِ شریعت عمل کو کر کے کہتا ہے کہ میں اصولِ ملامتیہ کی پیروی کر رہا ہوں، تو اس کا یہ فعل کھلی ہوئی گمراہی اور واضح معصیت اور تمام تر نفسانیت ہے۔ چنانچہ آج کل بہت سے لوگ ایسے پیدا ہو گئے ہیں کہ ترکِ خلق سے ان کا مقصود مقبولیت کا حصول ہے۔

اسی طرح امام ابوالقاسم قشیری اپنی تصنیف "رسالۃ القشیریہ فی علم التصوف" میں لکھتے ہیں:۔

وبناء ھذا الامر وملاکہ علی حفظ آداب الشریعۃ وصون الیہ عن مد الی الحرام والشبھۃ وحفظ الحواس عن المحظورات وعد الانفاس مع اللہ تعالیٰ عن الغفلات

تصوف کی ساری بنیاد اسی پر ہے کہ آدابِ شریعت کی پابندی رہے۔ حرام اور مشتبہ چیزوں سے کنارہ کشی اختیار کی جائے۔ ناجائز اوہام و خیالات سے حواس کو آلودہ نہ کیا جائے اور غفلتوں سے بچ کر اللہ تعالیٰ کی یاد میں وقت گزارا جائے۔

شیخ عبدالقادر جیلانی اپنی تصنیف "فتوح الغیب" میں سنت کی پیروی کے متعلق کہتے ہیں:۔

اتبعوا ولا تبتدعوا واطیعوا ولا تمرقوا

پیروی (سنت) کرتے رہو اور راہ بدعت نہ اختیار کرو۔

(باقی بر صفحہ آئندہ)

پھر اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ختمِ رسالت کے عقیدہ ہی نے مسلمانوں کو ایک الگ امت بنایا ہے۔ وحدتِ فکر اور اشتراکِ عمل بلا شبہ ایک قوم کے مختلف اجزا کو جوڑتے ہیں۔ انہی سے قوم کو ایک زبردست قوتِ رابطہ وضابطہ میسر آتی ہے جو اجسام کے تعدد اور نفوس کے تکثر کے باوجود لوگوں کو ایک جگہ جمع کرتی ہے مگر جو جذبہ ایک قوم کو دوسری قوم سے الگ ہونے کا شعور دیتا ہے، اُسے ایک علیحدہ امت کی تشکیل پر ابھارتا ہے، اُس کے اندر یہ احساس پیدا کرتا ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق)

وحدوا ولا تشرکوا — اطاعت کرو، اور دائرۂ اطاعت سے باہر نہ رہو، توحیدِ خداوندی کو مانو اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھیراؤ۔

ایک دوسرے مقام پر وہ ارشاد فرماتے ہیں:۔

اوصیك بتقوی اللہ وطاعة ولزوم ظاھر الشرع وسلامة الصدر — میں وصیت کرتا ہوں کہ اللہ کا تقویٰ اور اطاعت اختیار کرو، اور احکامِ شریعت کی پابندی لازم رکھو، اور سینہ کو (خباثتِ نفس سے) صاف رکھو۔

شیخ شہاب الدین سہروردیؒ عوارف المعارف میں اس حقیقت کا یوں اظہار کرتے ہیں:۔

فاوفر الناس حظا من متابعة الرسول اوفرھم حظا من محبة اللہ تعالیٰ — بس جو شخص جتنا زیادہ تبعِ رسولؐ ہے، اسی قدر زیادہ وہ محبتِ الٰہی کا بھی حصہ دار ہے

شیخ عبد الواحد بن زید صوفیہ قدیم کے ایک مسلّم سرخیل ہوئے ہیں۔ ان سے لوگوں نے صوفیاؒ کی تعریف دریافت کی تو انہوں نے صاف کہا:۔

القائمون بعقولهم علی السنة والعاکفون علیھا بقلوبھم — جو لوگ سنتِ رسول پر اپنی عقل کو صرف کرتے ہیں اور اپنے قلب سے متوجہ رہتے ہیں۔

ان اقوال کے نقل کرنے سے میرا مقصود یہ بتانا ہے کہ امتِ مسلمہ کا ہر شخص خواہ وہ کسی طبقہ یا گروہ سے تعلق رکھتا ہو، اس کے نزدیک نیکی، فلاح اور خیر کا آخری اور قطعی معیار رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہے، اور اس معیار کی وحدت نے ہی ملت بیضا کے مختلف عناصر کو ایک دوسرے کے ساتھ پیوست کر رکھا ہے۔

کہ تیرا اپنا ایک مستقل وجود ہے۔ وہ باہمی اشتراک کا نہیں بلکہ دوسروں سے اختلاف کا ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جس کے پروان چڑھنے اور پھلنے پھولنے سے قومیں بنتی ہیں اور امتیں وجود میں آتی ہیں۔ غالباً اسی تصور کی ترجمانی اُس عارفِ ربانی نے کی تھی جب اُس نے بہ بانگِ دُہل کہا :۔

"یہ نہ سمجھو کہ مَیں زمین میں صُلح کرانے آیا ہوں۔ صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلانے آیا ہوں۔ کیونکہ مَیں اس لیے آیا ہوں کہ آدمی کو اُس کے باپ سے اور بیٹی کو اس کی ماں سے اور بہو کو اس کی ساس سے جُدا کروں۔" (متی)

اسلام نے نسل، زبان، اور رنگ کی ہم آہنگی سے قوم کے مختلف افراد میں وحدت واتحاد پیدا کرنے میں مدد نہیں لی۔ بلکہ اس کے برعکس ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت سے یہ کام لیا ہے۔ اُس نے مسلمانوں کو ایک الگ امت بناتے وقت وطنیت کی دیواریں حائل کرنے کی بجائے نبوت کی حدبندی کی ہے۔ ملتِ اسلامیہ کی یہ وہ سرحد ہے جس کی حفاظت و پاسبانی امت کے ہر فرد نے کی ہے۔ اسے دنیا کی ہر چیز سے عزیز تر رکھا گیا اور اس کے متعلق مسلمانوں کا احساس اس قدر نازک اور شدید رہا ہے کہ جب کسی "من چلے" نے اس سرحدی دیوار میں رخنہ ڈالنے کی کوشش کی ہے تو پوری ملت کے اندر ہیجان پیدا ہو گیا۔ علامہ اقبال مرحوم نے اسی بنیادی فکر کی توضیح میں فرمایا ہے :۔

"مسلمانوں اور دنیا کی دوسری قوموں میں اصولی فرق یہ ہے کہ قومیت کا اسلامی تصور دوسری اقوام کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری قومیت کا اصل اصول نہ اشتراکِ زبان ہے، نہ اشتراکِ وطن۔ نہ اشتراکِ اغراضِ اقتصادی۔ بلکہ ہم لوگ اس برادری میں جو جنابِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائی تھی اس لیے شریک ہیں کہ مظاہرِ کائنات کے متعلق ہم سب کے معتقدات کا سرچشمہ ایک ہے[1]۔"

اپنے اسی خیال کی صراحت اُنہوں نے اپنے ایک بیان میں جو اخبار اسٹیٹسمین (STATES MAN) میں ۱۰ر جون ۱۹۳۵ء کی اشاعت میں طبع ہوا اس طرح فرمائی :۔

---

[1] "ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر" ترجمہ از مولانا ظفر علی خاں

"اسلام لازماً ایک دینی جماعت ہے جس کے حدود مقرر ہیں یعنی وحدت الوہیت پر ایمان انبیاء پر ایمان اور رسول کریم کی ختم رسالت پر ایمان۔ دراصل یہ آخری یقین ہی وہ حقیقت ہے جو مسلم اور غیر مسلم کے درمیان وجہ امتیاز ہے اور اس امر کے لیے فیصلہ کن ہے کہ کوئی فرد یا گروہ ملت اسلامیہ میں شامل ہے یا نہیں۔ مثلاً برہمو خدا پر یقین رکھتے ہیں اور رسول اکرم کو خدا کا پیغمبر مانتے ہیں۔ لیکن انہیں ملت اسلامیہ میں شمار نہیں کیا جاتا، کیونکہ وہ انبیاء کے ذریعہ وحی کے تسلسل پر ایمان رکھتے ہیں اور رسول کریم کی ختم نبوت کو نہیں مانتے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے کوئی اسلامی فرقہ اس حدِ فاصل کو عبور کرنے کی جسارت نہیں کر سکا۔ ایران میں بہائیوں نے ختم نبوت کے اصول کو صریحاً جھٹلایا لیکن ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ وہ الگ جماعت ہیں اور مسلمانوں میں شامل نہیں ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ اسلام بحیثیت دین کے خدا کی طرف سے ظاہر ہوا لیکن اسلام بحیثیت سوسائٹی یا ملت کے رسولِ کریمؐ کی شخصیت کا رہینِ منت ہے۔"

اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے گا تو یہ حقیقت از خود منکشف ہو گی کہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ اسلام میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد انبیاء کے آنے کی گنجائش ہے وہ درحقیقت اسلام کے استحکام پر ضرب لگاتا ہے۔ نبوت کے اجرا کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کی جمعیت ہمیشہ پراگندگی اور افتراق کے خطرہ میں مبتلا رہے اور ہر نئے نبی کے آنے پر کفر اور اسلام کی ایک نئی تفریق پیدا ہو جائے۔ اسلام نے دراصل نبوت کا دروازہ بند کر کے ملتِ اسلامیہ کو ایک وحدت اور پائیدار قوت عطا کی ہے۔

آئیے اب اسلام کے اس اساسی تصور پر ایک دوسرے زاویہ سے نگاہ ڈالیں۔ بنی اسرائیل کے نزدیک دنیا صرف بنی اسرائیل سے عبارت ہے۔ خدا صرف بنی اسرائیل کا خدا ہے۔ اس لیے بنی اسرائیل کے انبیاء اور صحیفوں نے اپنے پیغام کو صرف اسی ایک قوم تک محدود رکھا۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام نے بھی اپنا پیغام صرف بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کو دیا اور غیر اسرائیل کو اپنا پیغام سنا کر بچوں کی روٹی کتوں کو دینی پسند نہ کی۔ مگر اس کے برعکس پیغام محمدی دنیا میں خدا کا پہلا اور آخری پیغام ہے جسے کالے، گورے، عرب و عجم، ترک و تاتار، ہندی و چینی، زنگی و فرنگی، امیر و غریب سب کے لیے عام کیا گیا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں قرآن ارشاد فرماتا ہے:

تبٰرك الذی نزل الفرقان علٰی عبدہٖ لیکون للعٰلمین نذیرًا ۔ الذی له ملك السمٰوٰت والارض (الفرقان)

برکت والا ہے وہ خدا جس نے اپنے بندہ پر فیصلہ کرنے والی کتاب نازل کی تاکہ وہ تمام دنیا کو ہوشیار کرنے والا ہو۔ وہ خدا کہ اسی کی ہے سلطنت آسمان و زمین کی۔

قل یاایھا الناس انی رسول اللّٰہ الیکم جمیعان الذی له ملك السمٰوٰت والارض۔

کہہ دے اے لوگو! میں تم سب کی طرف اس اللہ کا رسول ہوں جس کے لیے آسمانوں اور زمینوں کی سلطنت ہے۔

وما ارسلنٰك الا کافة للناس بشیرًا و نذیرًا ۔

ہم نے نہیں بھیجا تم کو اے محمدؐ لیکن تمام انسانوں کے لیے خوشخبری سنانے والا اور ہشیار کرنے والا بنا کر۔

وما ارسلنٰك الا رحمة للعٰلمین

اے محمدؐ! ہم نے تم کو تمام اہل عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

ان آیات سے یہ امر پوری طرح ثابت ہوتا ہے کہ تمام انبیاء میں سے صرف حضور سرورِ کائنات نے اپنے پیغام کے متعلق دائمی، آخری، کامل اور عالمگیر ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ یہ صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے فرمایا "مجھ سے پہلے تمام انبیاء صرف اپنی اپنی قوم کی طرف بھیجے گئے اور میں تمام قوموں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔" ایسا کیوں ہے؟ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ حضور چونکہ آخری پیغمبر ہیں اس لیے خداوند تعالیٰ نے حضور کو ایسے عالمگیر پیغام سے نوازا جو ساری نوعِ بشری کے لیے ہے۔ آپ کی تعلیم و ہدایت اتنی مکمل اور جامع ہے کہ اب اس میں کسی ترمیم اور اضافہ کی ضرورت نہیں۔ اب کوئی چیز ایسی باقی نہیں رہی جس کا انکشاف انسانیت کے لیے ضروری ہو، اور نہ ہی عملِ صالح اور ہدایت کا کوئی گوشہ ایسا رہ گیا ہے جس کو آشکار کرنے کے لیے نوعِ انسانی کسی نبی کی محتاج ہو۔ اس حقیقت کا متعصب سے متعصب مستشرقین تک نے اعتراف کیا ہے۔ مثال کے طور پر باسورتھ اسمتھ کہتا ہے:

"اسلام میں ہر چیز ممتاز ہے، یہاں دھندلا پن اور راز نہیں۔ ہم تاریخ رکھتے ہیں۔ ہم محمدؐ

کے متعلق اس قدر جانتے ہیں جس قدر لوتھر اور ملٹن کے متعلق۔ میتھالوجی، فرضی افسانے اور مافوق الفطرت واقعات ابتدائی عرب مصنفین میں نہیں ہیں یا اگر ہیں تو وہ آسانی سے تاریخی واقعات سے الگ کیسے جا سکتے ہیں۔ کوئی شخص یہاں نہ خود کو دھوکا دے سکتا ہے اور نہ ہی دوسرے کو دے سکتا ہے۔ یہاں پورے دن کی روشنی ہے۔ جو ہر چیز پر پڑ رہی ہے اور ہر ایک تک یہ پہنچ سکتی ہے۔

؎ اسلام میں یہ تصور کہ نبی آخر الزمان کی لائی ہوئی کتاب اور آپ کے جملہ آثار رسالت اپنی صحیح شکل میں نہ صرف محفوظ ہیں بلکہ درخشندہ ہیں۔ لہٰذا امتِ مسلمہ کو کسی نئی کتاب یا نبوت کی ضرورت نہیں، اس قدر بنیادی اہمیت کا حامل رہا ہے کہ اس نے مسلمانوں کے فنون تک کو متاثر کیا۔ چنانچہ مسلمانوں کی تعمیر کردہ عمارات میں یہ حقیقت پوری طرح جلوہ گر نظر آتی ہے۔ "انسان اور آدمی" میں پروفیسر عسکری نے اسلامی فنِ تعمیر کی روح کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے :۔

"دوسرے مذہبوں کے معابد پر غور کیجیے تو دیکھیں گے کہ عمارات میں پر اسرار ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کہیں بالکل اندھیرا ہے تو کہیں سورج کو رنگے ہوئے شیشوں میں سے گزارا گیا ہے تاکہ دماغ پر ایک مخصوص قسم کی اجنبیت اور ہیبت طاری ہو سکے۔ اسلامی عمارتوں میں اس قسم کی بازی گری مطلق روا نہیں رکھی گئی۔ مسجد کی سب سے عام چیز صحن ہے جس میں زیادہ سے زیادہ روشنی اور ہوا آتی ہے۔ بات یہ ہے کہ خود اسلام کا سارا فلسفہ زندگی میں ابہام پرستی اور رمزیت سے کوسوں دور ہے۔ . . . مسجدوں کے زیر اثر دوسری عمارتوں میں بھی یہ خصوصیت بہت نمایاں نظر آتی ہے . . . . اسلامی عمارتوں کے نقشے بڑے سیدھے سادے ہوتے ہیں۔ اسلامی عمارتیں ہندو یا گوتھک عمارتوں کی طرح بھول بھلیاں نہیں ہوتیں۔ ہندو عمارتوں کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ بنانے والے کو بیچ میں کوئی بات سوجھ گئی اور وہ کر گزرا۔ مگر اسلامی عمارات ایسی معلوم ہوتی ہیں جیسے ذرا ذرا سی تفصیل پہلے سے سوچی ہوئی ہو۔ اسلامی عمارت نہ ساز و فنی جذبات یا اثرات کی پیروی نہیں کرتا بلکہ ایک عقلی اور فلسفی تفننے کی ؎

(باقی بر صفحہ آئندہ)

پیغامِ محمدی کے بارے میں مسلمانوں کے اس طرزِ فکر نے کہ یہ خدا کا وہ آخری الہام ہے جس کی حفاظت کا خود خالقِ کائنات نے وعدہ فرمایا ہے، اور اس وجہ سے یہ اپنی اصل شکل میں ہمارے پاس موجود ہے، ان کے غور و فکر کے سارے انداز کو بدل دیا ہے۔ مسلمان جب تک خدا اور نبی امی پر ایمان رکھتا ہے کبھی اپنے دل کے اندر یہ ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ کوئی "فوق البشر" براہِ راست خدا سے ہم کلام ہو کر اُسے منشاءِ ایزدی سے شناسا کرے۔ وہ جانتا ہے کہ خدا نے اپنی رضا نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر پوری طرح واضح فرما دی ہے، لہٰذا اسے معلوم کرنے کے لیے کسی معصوم اور ملہم کاہنِ اعظم کی ضرورت نہیں۔ جو خیمۂ عبادت میں "قدس الاقداس" کے پاس جا کر احکامِ الٰہی کے اسرار و رموز سے اُسے واقف کرے۔ اُسے علم ہے کہ نبوت کا باب بند ہو جانے کے بعد اُس کے لیے منشاءِ ربانی کو جاننے کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ وہ خود تفکر و تدبر سے کام لے کر قرآن اور سنت سے اسے معلوم کرنے کی کوشش کرے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے بجائے انسان کو یہ تعلیم دینے کے کہ تم اتباعِ نبوی سے نبوت حاصل کرنے کی بیسود کوشش کرو، اُسے یہ سمجھایا ہے کہ تم نبی آخر الزماں کی پیروی اختیار کر کے ایک سچے مسلمان بنو اور اس طرح دنیا اور آخرت میں نائز المرام ہو۔ نبوت اسلامی تعلیمات کی رُو سے اکتسابی نہیں بلکہ خالصتہً وہبی کمال ہے۔ اس لیے کوئی شخص اسے ذاتی سعی و جہد سے حاصل نہیں کر سکتا۔ قرآن پاک نے اپنا سارا زور اس بات پر صرف کیا ہے کہ محمد رسول اللہ کی دعوت کو لوگوں کے ذہن نشین کرایا جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وضاحت نہایت حکیمانہ انداز میں یوں فرمائی ہے:-

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) بعض لوگوں کو یہ اقلیدسی زنجیریں نہایت گراں گزرتی ہیں خصوصاً یورپ کی بنجر عقلیت پرستی سے اکتائے ہوئے لوگوں کو۔ مگر وہ نہیں جانتے کہ یہ تعمیر ہمارے بنیادی تصور کے رُخِ زیبا کا عکس ہے۔ ایک تو حضورؐ نے دین کو اتنا صاف، بے میل اور غیر مبہم پیش فرمایا کہ آپ مسلمانوں کے ذہن کے اندر کوئی ابہام پیدا نہیں ہو سکتا۔ دوسرے انہوں نے امتِ مسلمہ کو آغاز سے انتہا تک اس کے پروگرام سے واقف کر دیا ہے۔ ایک ان پڑھ سے ان پڑھ مسلمان بھی یہ جانتا ہے کہ اُس کی ذمہ داریاں کہاں سے شروع ہو کر کہاں ختم ہوتی ہیں۔

ان هٰذا القرآن حبل اللّٰه، و هو النور المبین و الشفاء النافع و عصمة من تمسك به و نجاة من تبعه

یہی قرآن اللہ کی رسّی ہے ۔ نور مبین ہے اور شفاءِ نافع ہے ۔ یہی اس کی پناہ ہے جو اس کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے اور اس شخص کے لیے وسیلۂ نجات ہے جو اس کی پیروی کرے ۔

آپ قرآنِ پاک کا جس قدر مطالعہ کریں گے یہی پائیں گے کہ اس میں انسان کو عقل و فکر، فہم و شعور کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی ہدایت کی گئی ہے ۔ چنانچہ کلامِ پاک میں بے شمار مقامات ایسے ملتے ہیں جہاں اَفَلَا یَتَفَکَّرُوْنَ، اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ، اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ، اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ۔ لَوْتَشْعُرُوْنَ ۔ اِنَّمَا یَتَذَکَّرُ اُولُوا الْاَلْبَاب کہا گیا ہے ۔ اس میں ہر وہ طریقہ استعمال کیا گیا ہے جس سے انسانی عقل حرکت میں آسکے ۔ قرآن جب کوئی حجت قائم کرتا ہے تو عقل ہی کی بنا پہ کرتا ہے ۔ ایک طرف وہ عقل کے فقدان پر اظہارِ غضب کرتا ہے اور دوسری طرف عقل و خرد کے صحیح استعمال پر اظہارِ خوشنودی کرتا ہے ۔ اس نے جہاں کہیں دوسری ملتوں اور مذاہب کے پیروؤں اور مادیین و دہریین سے مجادلہ کیا ہے وہاں وہ دلیل و برہان سے ان پر ضرب لگاتا ہے اور تفکر و تدبر کی طرف ہی انہیں دعوت دیتا ہے ۔

لهم قلوب لا یفقهون بها و لهم اَعْیُنٌ لا یُبصرون بها و لهم اٰذان لا یسمعون بها اُولٰئك كالانعام بل هم اَضَلُّ اولٰئك هم الغافلون (۷: ۲۲)

وہ دل رکھتے ہیں مگر ان سے سوچتے نہیں، وہ آنکھیں رکھتے ہیں مگر اُن سے دیکھتے نہیں، وہ کان رکھتے ہیں مگر اُن سے سنتے نہیں، وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ اُن سے بھی زیادہ گمراہ ۔ وہ دراصل غافل ہیں ۔

انَّ فی خلق السمٰوات و الارض و اختلاف اللیل و النهار و الفلك التی تجری فی البحر بما ینفع الناس و ما انزل اللّٰه من السمآء من مآءٍ فاحیا به الارض بعد موتها و بثَّ فیها من كل دآبّةٍ و

بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے، اور رات دن کی گردش اور ان کشتیوں میں جو لوگوں کے نفع کی چیزیں لیے ہوئے سمندر میں چلتی ہیں، اور اس پانی میں جسے اللہ آسمان سے نازل کرتا ہے اور جس کے ذریعہ سے مُردہ زمین کو پھر سے زندہ کر دیتا ہے اور پھر اس میں ہر

تصریف الریاح والسحاب المسخر بین السماء والارض لآیات لقوم یعقلون۔ (۲ : ۲۰)

...قسم کے جانور پھیلا دیئے ہے اور ہواؤں کی گردش اور زمین و آسمان کے درمیان گھرے ہوئے بادلوں میں، ارباب عقل کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔

افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت والی السماء کیف رفعت والی الجبال کیف نصبت والی الارض کیف سطحت

کیا لوگ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بنایا گیا ہے اور آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بلند کیا گیا اور پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے نصب کیے گئے ہیں اور زمین کو نہیں دیکھتے کیسے بچھائی گئی ہے۔

وفی انفسکم افلا تبصرون۔ (۵۱ : ۱)

اور خود تمہارے اندر کیسی نشانیاں ہیں کیا تم دیکھتے نہیں ہو۔

سنریھم آیاتنا فی الآفاق وفی انفسھم حتی یتبین لھم انه الحق۔ (۴۱ : ۶)

ہم ان کو تمام اطراف عالم میں اور خود ان کے اپنے اندر اپنی نشانیاں دکھائیں گے تاکہ ان پر ظاہر ہو جائے کہ یہ قرآن حق ہے۔

یہاں اتنی گنجائش نہیں کہ اس باب میں جتنی آیات قرآن کریم میں آئی ہیں ان سب کو نقل کیا جائے۔ اس لیے ہم نے صرف چند اقتباسات پیش کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ لیکن اگر اس سلسلہ میں مزید تلاش و جستجو کی جائے اور اسی نقطۂ نظر سے دوسرے الہامی ادب کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ بحیثیت مجموعی جس قدر اس کتاب نے لوگوں میں عقل و فکر کو اجاگر کیا ہے اور مسائل پر غور و فکر کرنے کی عادت ڈالی ہے، دنیا کی کوئی دوسری کتاب اس معاملہ میں اس کی ساجھی نہیں ہو سکتی۔ علامہ اقبال نے اسی موضوع کے متعلق فرمایا ہے :-

"قرآن میں عقل و تجربے سے بار بار خطاب کرنا اور اس بات پر زور دینا کہ فطرت کا مشاہدہ اور تاریخ کا مطالعہ علم انسانی کے سرچشمے ہیں یہ سب اسی ایک تصور یعنی ختم نبوت کے مختلف پہلو ہیں[لہ]"

لہ THE RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM.

پھر عقل کی طرف قرآن کی اس دعوت نے مسلمانوں کے اندر استقرائی طریق تحقیق کو رواج دیا، کیونکہ حضورؐ کے تشریف لے جانے کے بعد مسلمانوں کو قرآن و سنت سے احکام کا استنباط کرنے کے لیے جس خود اعتمادی کی ضرورت ہے اس کے لیے یہ طریقہ بہت مفید اور کارآمد ہو سکتا ہے۔ حقیقت کی کنہ تک پہنچنے کے لیے ظن و تخمین[۱] کچھ کام نہیں آتے۔ بلکہ اس کے لیے مشاہدہ، تجربہ اور پیمائش کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر گستاؤ لیبان اپنی کتاب "تمدن عرب" میں اس مسئلہ کی نسبت یوں رقم طراز ہیں۔

"تجربہ اور مشاہدہ کو اقوال اساتذہ کے مقابل میں تحقیقات علمی کے اصول قرار دینا عموماً بیکن کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ لیکن اس وقت تسلیم کرنا چاہیے کہ اس کے موجد عرب تھے۔ کل محققین یورپ علی الخصوص ہمبولڈ جنہوں نے عربی تصنیفات کو دیکھا ہے۔ اب اس امر کے قائل ہیں۔ ہمبولڈ یہ لکھنے کے بعد کہ علمی ترقی کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ انسان خود اپنے ارادے سے یعنی بذریعہ تجربہ حوادث طبیعیہ کو پیدا کر سکے بطور تمثیل لکھتا ہے "عربوں نے یہ درجہ جس سے متقدمین بالکل ناواقف تھے حاصل کر لیا تھا"۔

موسیو لدی لکھتے ہیں "دار العلوم بغداد کی تعلیم میں بہت بڑی بات یہ ہے کہ اس کا طرز استدلال بالکل علمی اصول پر مبنی ہے یعنی معلوم کے ذریعہ غیر معلوم کو دریافت کرنا، حوادث کا درست مشاہدہ کر کے ان معلولات کے ذریعہ سے علل نکالنا اور ان ہی قضایا کو ماننا جو تجربہ سے ثابت ہو چکے ہوں یہ ان اساتذہ کے اصول تحقیق تھے۔ نویں صدی عیسوی کے عربوں کو یہ نتیجہ خیز طریقۂ تحقیق معلوم تھا جو مدت ہائے دراز کے بعد ہمارے حال کے محققین کے ہاتھوں میں بڑی بڑی اکتشافات[۲] اور ایجادوں کا آلہ بن گیا"[۲]۔

---

[۱] ان الظن لا یغنی من الحق شیئاً۔

[۲] اقبال نے کہا ہے کہ سائنس یا حکمت اشیاء فرنگی زاد نہیں بلکہ مسلمان زاد ہے

حکمت اشیاء فرنگی زاد نیست	اصل او جز لذت ایجاد نیست
نیک اگر بینی مسلمان زادہ است	ایں گہر از دست ما افتادہ است
ایں پری از شیشۂ اسلاف ماست	باز صیدش کن کہ او از قاف ماست

مگر اس ضمن میں یہ بات ذہن نشین رہے کہ اسلام نے جس عقل کی طرف دعوت دی ہے وہ دَورِ جدید کی بنجر عقلیت پرستی سے بالکل مختلف ہے۔ پھر اُس نے جس طرح سے لوگوں کے فہم و شعور کو اُبھارا ہے وہ بھی عہدِ حاضر سے یکسر جداگانہ ہے۔ جدید تمدن کی سب سے بڑی بدنصیبی اور نارسائی یہی ہے کہ اس نے عقل کو بے زمام چھوڑ دیا کہ جدھر چاہے جائے اور جو چاہے کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بے راہ روی میں ان گلی کوچوں کی طرف نکل گئی جہاں تک اُس کی رسائی ممکن نہ تھی اور بالآخر اُسے رسوا ہونا پڑا۔ اہلِ یورپ کے پاس چشمِ نگراں تو ہے لیکن ان کی بڑی محرومی یہ ہے کہ اُن کے دلوں کو وحی اور الہام سے منور نہیں کیا گیا۔ اور یہ نعمت اتباعِ نبوت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی ؎

دلِ بیدار ندادند بہ دانائے فرنگ

ویں قدر ہست کہ چشمِ نگرانے دارد

اگر اہلِ مغرب تسخیرِ زمان و مکاں کی صلاحیتوں کو احکامِ الٰہی کے تحت بروئے کار لاتے تو انہیں ان مصائب کا سامنا نہ کرنا پڑتا جن میں وہ آج اپنے آپ کو بُری طرح گرفتار پاتے ہیں۔ تہذیبِ فرنگ نے انسان کو جس بربادی کی طرف دھکیلا ہے وہ اسی "بے زمام" عقل کی پرستش کا فطری نتیجہ ہے۔

عصرِ حاضر را خرد زنجیر پاست

جانِ بے تابے کہ من دارم کجاست

اسی طرح ہدایتِ الٰہی کی راہنمائی کے بغیر استقرائی طریقِ تحقیق بھی اہلِ یورپ کے لیے سخت مہلک ثابت ہوا۔ یورپین تہذیب کی اصل روح ایجاد و تسخیر اور اثباتِ خودی میں مضمر ہے، جس کی بدولت انسان کو کائنات میں ایسے تصرفات حاصل ہوئے جو پہلے کبھی نہ ہوئے تھے اور یہ سب کرشمہ ہے مشاہدہ اور تجربہ کا۔ ان کی بدولت انسان کے اندر تصرف و ایجاد کی بے پناہ قوتیں پیدا ہوئیں اور انہوں نے ایک ایک کر کے ان سب رکاوٹوں کو دُور کر دیا جو انسان کے لیے سنگِ گراں تھیں اور جن کی وجہ سے اشیاء کے باہمی روابط میں ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکتی تھی لیکن جدید یورپین تہذیب کی بڑی کوتاہی یہ ہے کہ روحانی اور اخلاقی اقدار کی پامالی کے باعث اس کا توازن بگڑ گیا۔ اس لیے موجودہ انسان نے مشاہدہ اور تجربہ سے فطرت

اور زندگی کے واقعات و حوادث کی صحیح تعبیر کرنے کی بجائے مادیت پرستی کو اپنا شعار بنا لیا۔ وہ مادی زندگی کی لذتوں میں ایسا منہمک ہو گیا کہ ان کے علاوہ وہ کچھ سوچ نہیں پاتا۔ اُسے کبھی اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ آخر عمل کی یہ ساری مجنونانہ تگ و دو کس لیے ہے؟ کیا یہ مقصود بالذات ہے؟ یا کسی بڑے مقصد کے حصول کا ذریعہ۔ یہاں آکر اُس کا ذہن اُلجھ کر رہ جاتا ہے۔ وہ یہی سمجھتا ہے کہ مادی فوائد و لذائذ کا جمع کرنا ہی انسان کا مطمحِ نظر ہے۔ اس کے برعکس مسلمانوں نے مشاہدہ اور تجربہ سے زندگی کی روحانی اور اخلاقی اقدار کو معلوم کیا۔ انہوں نے مادی زندگی کو ایک بالآخر روحانی زندگی تک پہنچنے کا وسیلہ بنایا۔

اگر تاریخ کی ورق گردانی کی جائے تو معلوم ہوگا کہ عقلیت اور مذہبیت ابتدائے آفرینش سے لے کر ہزاروں سال تک آپس میں برسرِ پیکار رہے کبھی "عقلیت" مذہبیت پر غالب آجاتی اور اسے زندگی کے ہر میدان سے خارج کر دیتی اور کبھی "مذہبیت" عقلیت کو شکستِ فاش دے کر فتح کے شادیانے بجاتی ہے۔ ان دونوں کے درمیان یہ جنگ کئی صدیوں تک جاری رہی۔ البتہ کبھی کبھی خدا کے "پاکباز بندے" درمیان میں آکر ان کے مابین صلح کرا دیتے۔ مگر وہ صلح وقتی اور عارضی ہوتی اور پھر میدان کارزار گرم ہو جاتا۔ حتیٰ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریف لاکر نہ صرف ان کے درمیان مصالحت کرائی بلکہ عقل کو "تابع فرمانِ نبوت" کر کے اُس کی حدودِ کار کو بھی ہمیشہ کے لیے متعین کر دیا۔ حضور کا یہ آخری اور قطعی فیصلہ اس وجہ سے بھی تھا کہ آپ نبی ہونے کے علاوہ ختم المرسلین بھی ہیں۔ (باقی)

ایک ضروری تصحیح

گذشتہ "ترجمان" (ذی الحجہ ۱۳۶۸ھ) کے بحرِ رسائل و مسائل میں صفحہ ۴۵ پر ایک سوال کے جواب میں غلطی سے یہ کہہ دیا گیا ہے کہ زکوٰۃ کے مصارف سورۂ کہف میں بیان ہوئے ہیں، حالانکہ یہ مصارف سورۂ توبہ (رکوع ۸) میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس سہو پر دلی افسوس ہے۔ قارئین سے درخواست ہے کہ وہ تصحیح فرمالیں۔ (ادارہ)

مصلحی احکام پر زمانہ کی تبدیلی کا اثر

(شیخ محمد الزرقاء۔ پروفیسر قانون اسلامی، لاء کالج، شام)

فقہائے امت اور ائمہ مجتہدین کے ہاں یہ حقیقت بالکل مسلّم اور معروف ہے کہ ماحول اور زمانے کے تغیرات شریعت کے مصلحی اور اجتہادی قوانین پر نمایاں حیثیت سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس قسم کے قوانین کا اصل مقصد عدل وانصاف کا قیام، مصالح کا حصول اور مفاسد کا انسداد ہے۔ اس لیے حالاتِ زمانہ اور اخلاق عامّہ سے ان احکام و قوانین کا گہرا تعلق ہے۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ بہت سے احکام جو خاص احوال و حالات میں بے حد مفید ہوتے ہیں، حالات کے بدل جانے کے بعد وہی احکام غیر مفید بلکہ اُلٹے نقصان دہ بن جاتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ مختلف مذاہب کے فقہائے متاخرین نے بہت سے مسائل میں اپنے مذہب کے ائمہ اور فقہائے متقدمین کے خلاف فتوے دیئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا ہے کہ اس اختلاف فتویٰ کا اصل سبب ان کے دَور کا اخلاقی انحطاط یا تمدنی انقلاب ہے اس لیے اپنے پیشروؤں سے ان کا یہ اختلاف حقیقی اختلاف نہیں ہے بلکہ خود متقدمین اگر ان کے زمانے میں ہوتے تو ان کا فتویٰ متاخرین کے فتویٰ کے مطابق ہوتا۔ اسی بنیاد پر فقہ کا یہ قاعدہ کلیہ وضع کیا گیا ہے کہ:۔

لاَ یُنکر تغیّر الاحکام بتغیر الازمان۔	زمانے کے حالات بدل جانے کے باعث احکام میں تبدیلی قابلِ اعتراض نہیں ہے۔

لیکن اس متفق علیہ اصول کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی یاد رکھنی چاہیے کہ تمام فقہائے مذاہب اس بات پر بھی متفق ہیں کہ حالات اور زمانے کے تقاضوں کے لحاظ سے صرف ان ہی احکام میں تغیر

کیا جا سکتا ہے جو اول تو اجتہاد سے تعلق رکھتے ہوں، ثانیاً ان میں منشائے اجتہاد محض مصلحت ملت ہو۔ ایسے اصولی احکام میں تغیر و تبدل کا سوال پیدا نہیں ہوتا جو قرآن و سنت کے واضح نصوص پر قائم ہیں۔ مثلاً محرمات کی حرمت، لین دین کے معاملات میں فریقین کی رضامندی، اپنی رضامندی سے کیے ہوئے معاہدات کا خود پابند ہونا، تاوان کی ادائیگی کا ذمہ دار رہنا، اقرار کی ذمہ داری کا صرف اقرار کرنے والے تک محدود رہنا، ایذا رسانی کو روکنا اور جرائم کا قلع قمع کرنا، فساد کے ذرائع کو بند کرنا، حقوق کی حفاظت، ہر مکلف کا خود اپنے فعل اور اپنی غلطی کا ذمہ دار ہونا اور بے گناہ کو گنہ گار کی جگہ سزا دینے کی اجازت نہ دینا اور اسی طرح کے دوسرے اساسی امور جن کا قیام و بقا شریعت کے مقاصد میں سے ہے ان میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کی اجازت نہیں ہے، کیونکہ یہی تو وہ بنیادی اصول ہیں جن کی تعلیم شریعت نے اس لیے دی ہے کہ ان کے ذریعہ سے امتوں کے بگاڑ اور زمانے کے غلط رجحانات کا علاج کیا جا سکے۔ البتہ ان اصولوں کو روبعمل لانے کے ذرائع و وسائل میں اور واقعات و حالات پر ان کی تطبیق میں بدلے ہوئے حالات اور اختلاف زمانہ کا لحاظ کیا جائے گا۔

مثال کے طور پر حق داروں کے حقوق کی حفاظت کے لیے پہلے جو طریقہ اختیار کیا جاتا رہا ہے وہ یہ تھا کہ ایک ہی قاضی معاملات کا فیصلہ کرتا تھا اور اسی کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوا کرتا تھا۔ اب اس طریقہ میں موجودہ حالات کے لحاظ سے یہ ترمیم کی جا سکتی ہے کہ مقدمہ کی سماعت کے لیے ایک قاضی کے بجائے متعدد ججوں پر مشتمل ایک بنچ مقرر کی جائے اور ایک ہی عدالت کا فیصلہ آخری نہ ہو بلکہ اپیل کی عدالتیں بھی قائم کی جائیں۔ اس ترمیم کی وجہ اس دور میں تقویٰ اور ایمانداری کی کمی ہے۔ جس کے باعث ایک ہی قاضی کو آخری فیصلہ کر دینے کے اختیارات دے دینے میں اندیشہ ہے کہ انصاف کے تقاضے کما حقہ پورے نہ ہوں۔

اس مثال سے یہ امر واضح ہے کہ شرعی قوانین میں حالات زمانہ کے تقاضوں کے لحاظ سے خواہ کتنا ہی تغیر کیوں نہ ہو جائے، بہرحال صاحب حق کے حق کا استقرار، مصالح کا حصول، اور مفاسد کا سدباب، وہ شرعی اساسات ہیں جن کا ہمیشہ پیش نظر رہنا ضروری ہے۔ اور احکام کے تغیر کی حقیقت

اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ شارع کے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے ذرائع اور وسائل میں تبدیلی کر دی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت نے بالعموم ذرائع اور وسائل کو خود متعین نہیں کیا ہے، تاکہ ہر زمانے میں مقاصد کے لیے بہتر سے بہتر اور کامیاب سے کامیاب تدابیر اختیار کرنے کی آزادی برقرار رہے۔

حالات زمانہ میں تغیّر کی دو صورتیں زمانے کے حالات میں جس تبدیلی کی وجہ سے شرعی احکام میں تغیر کرنا پڑتا ہے اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ یہ تغیّر لوگوں کے فساد اخلاق، تقویٰ کے نقصان اور ضعف ایمان کے باعث ہو۔ اس قسم کے تغیّر کو عام طور پر "فساد زمانہ" سے تعبیر کرتے ہیں۔

تغیّر کی دوسری صورت یہ ہے کہ تمدن کی ترقی کی وجہ سے نئے نئے ادارے اور جدید قسم کی تنظیمات وجود میں آجائیں اور نئے قوانین، نئے قواعد و ضوابط، اور جدید اقتصادی معاملات کے لیے نئے نئے طریقے اختیار کرنے پڑیں۔ یہ دوسری قسم کا تغیر بھی پہلی قسم کی طرح ان اجتہادی احکام کے تغیر کا سبب بنتا ہے جو اس سے قبل کے حالات میں اختیار کیے گئے تھے، اور جو موجودہ حالات کے مطابق نہیں ہیں، اس لیے کہ تبدیل شدہ حالات میں سابقہ اجتہادی احکام کا برقرار رکھنا یا تو بے نتیجہ ہوگا یا نقصان دہ، اور ظاہر ہے کہ شریعت ان دونوں نقائص سے پاک ہے۔ شاطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب الموافقات میں لکھا ہے کہ "شریعت بے مقصد احکام کا مجموعہ نہیں ہے۔" اس قول کی مزید تشریح آگے آئے گی۔ ذیل میں دونوں قسم کے تغیرات کے باعث احکام میں تغیّر کی چند مثالیں پیش کی جا رہی ہیں۔ یہ مثالیں بیشتر فقہائے احناف کے فتاویٰ سے ماخوذ ہیں۔

زمانے کے انحطاط کے باعث اجتہادی احکام میں تغیّر کی چند مثالیں بعض مسائل جن میں فقہاء متاخرین نے اپنے مذہب کے ائمہ کے اجتہاد کے خلاف عمل کیا ہے اور اس اختلاف کا سبب انحطاط زمانہ کو قرار دیا ہے یہ ہیں۔

۱۔ مذہب حنفی کا یہ طے شدہ اصول ہے کہ قرض کی ذمہ داری متعروض کی ذات پر عائد ہوتی ہے۔ اس کی املاک پر اس کے قرض کی براہ راست ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے ان کے نزدیک متعروض اپنی املاک اور اپنے اموال میں جو تصرف بھی کرے وہ شرعاً درست ہوگا، اگرچہ اس پر قرض اس کے

مملوکات اور اموال کی مقدار سے زیادہ ہی کیوں نہ ہو۔ یہاں تک کہ اگر مقروض اپنا سارا مال وقف کر دے اور قرض کی ادائیگی کے لیے کچھ بھی باقی نہ رکھے تو بھی اُس کا یہ وقف فقہائے حنفیہ کے نزدیک شرعاً جائز ہو گا بشرطیکہ حکومت نے اس کو اپنے مال میں تصرف کرنے سے روک نہ دیا ہو۔ یہ مذہب حنفی کا ایک قیاسی اصول تھا لیکن جب لوگوں کی نیتوں میں فساد آگیا اور دوسروں کے حقوق کی ادائیگی کا احساس کم ہو گیا تو لوگوں نے قرض خواہوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے اپنے مال کو خود اپنی ذات پر یا اپنی اولاد پر اور سب سے آخر میں رفاہ عام کے کسی کام پر وقف کرنا شروع کر دیا۔ جب متاخرین فقہاء حنفیہ نے یہ صورتِ حال دیکھی تو سب سے پہلے مذہب حنفی کے اس اجتہاد کے خلاف مولیٰ ابوالسعودؒ[1] مفتی روم نے فتویٰ دیا کہ مقروض کا وقف صرف اُسی قدر مال میں جائز تصور کیا جائے گا جو اُس پر عائد شدہ قرض سے زائد ہو۔ اسی سلسلے میں انہوں نے سلطان کی جانب سے ایک حکم نامہ بھی جاری کرایا۔ ان کے زمانے اور بعد کے فقہاء نے اس اجتہاد اور اس حکم کو تسلیم کیا۔

فقہائے حنفیہ نے قرض خواہوں کے حقوق کے تحفظ کا جو انتظام کیا ہے وہ وقف ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ مقروض اگر قرض خواہوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے وقف کے علاوہ دوسرے طریقے مثلاً بیع یا ہبہ وغیرہ اختیار کرنے لگیں جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے تو ان کے اس قسم کے تصرفات کو بھی ناجائز قرار دیا جائے گا اور اگر قرض خواہوں نے مقروض کو ان تصرفات کی خود ہی اجازت نہ دی ہو تو ان تصرفات کو باطل کرانے کا ان کو اختیار حاصل ہو گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو علت وقف کو باطل کر دیتی ہے بعینہٖ وہی ان تصرفات میں بھی پائی جاتی ہے۔ اُس دور کے فقہاء نے صرف وقف ہی

---

[1] ابوالسعود کا پورا نام محمد ابن محمد العمادی ہے۔ ترکی کے ایک گاؤں اسکلیب کے باشندے ہیں۔ اسی لیے مفتیٔ روم (ترکی) کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ ۹۸۲ھ میں وفات پائی۔ سلطان سلیم اور سلطان سلیمان کے زمانے میں فقہاء حنفیہ کے سرگروہ تھے۔ عثمانی سلطنت کے مفتی عام ہونے کے علاوہ قسطنطنیہ اور برسہ کے قاضی تھے۔ پوری زندگی بڑی عظمت کے ساتھ گذاری۔ بعض مسائل میں اجتہاد بھی کیا ہے۔ ان کی بعض آراء کو ان کے زمانے کے بیشتر علماء نے قبول کیا ہے۔ عربی کے قادر الکلام شاعر تھے۔ آپ کی تفسیر قرآن بھی مشہور ہے۔

کے باطل ہونے کی صراحت اس وجہ سے کی ہے کہ اُن کے زمانے میں قرض کی ادائیگی سے بچنے کے لیے یہی طریقہ زیادہ ترائج تھا۔ حنبلی فقہ کے لحاظ سے بھی ایسی حالت میں "وقف" نیز دیگر تصرفات کو ناجائز قرار دیا جائیگا، اگرچہ یہ جزئیہ مذہب حنبلی کے معروف اصول کے خلاف ہوگا۔

۲۔ مذہب حنفی کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ مالِ مغصوب کی مدد سے حاصل کردہ نفع کی قیمت کی ادائیگی غاصب کے ذمہ نہیں ہے۔ صرف اصل کی واپسی اور اگر اصل برباد ہوگئی ہو یا خراب ہوگئی ہو تو اس کی قیمت کی ادائیگی غاصب کے ذمہ ہوگی۔ کیونکہ حنفیہ کے نزدیک نفع کی بذات خود کوئی قیمت نہیں ہے۔ کرائے کی شکل میں نفع کی مقدار کا جو تعین کیا جاتا ہے وہ اُس معاہدے کی وجہ سے ہوتا ہے جو کرائے دار اور مالک کے درمیان طے پاتا ہے۔ غصب کی صورت میں اس قسم کا کوئی معاہدہ عمل میں نہیں آتا۔ اس لیے نفع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

لیکن متاخرین نے جب غصب کے معاملے میں لوگوں کی دلیری اور دینی احساس کی کمی دیکھی تو انہوں نے یہ فتویٰ دے دیا کہ غصب کردہ مال اگر وقف کا یا کسی یتیم کا ہو یا کسی نفع آور کام کے لیے مخصوص کیا جا چکا ہو تو غاصب مدتِ غصب کے نفع کا تاوان ادا کرے گا۔ مذہب حنفی کے اصول کے خلاف یہ فتویٰ لوگوں کو ظلم و زیادتی سے روکنے کے لیے دیا گیا۔ اس کا بنیادی سبب زمانے کا بگاڑ ہے۔ متاخرین کے زمانے میں اسی فتوے پر عمل درآمد کیا جانے لگا۔

اسی علت پر قیاس کرتے ہوئے حنفی اجتہاد کے قواعد میں یہ اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ مذکورہ تین قسم کے اموال مغصوبہ کے علاوہ دوسرے قسم کے اموال کے نفع کا تاوان بھی غاصب کے ذمہ ہوگا۔ کیونکہ اس زمانے میں نیتوں کا فساد اور زیادہ بڑھ گیا ہے۔ آج کل دوسروں کے مال پر لوگوں کی نظریں لگی رہتی ہیں اور حقوق ادا کرنے میں پہلوتہی عام ہوگئی ہے۔ مزید برآں ہر قسم کے اموالِ مغصوبہ سے حاصل کردہ نفع کے تاوان کی ذمہ داری غاصب پر عائد کرنا آج کل کے قوانین کے مطابق بھی ہے اور مصالح کا اقتضاء بھی یہی ہے۔

۳۔ مذہب حنفی کا ایک اور اصول یہ ہے کہ اگر بیوی کو مہر معجل ادا کر دیا جائے تو شوہر اسے

جہاں چاہے لے جا سکتا ہے۔

لیکن جب اخلاقی انحطاط بڑھ گیا ظلم و زیادتی کی کثرت ہو گئی اور لوگ اپنی بیویوں کو دُور دراز ملکوں میں جہاں بیوی کے اعزہ میں سے کوئی نہیں ہوتا ہے لے جا کر ان کے حقوق غضب کرنے لگے اور ان پر ہر قسم کے مظالم توڑنے لگے تو متاخرین نے اس صورتِ حال کو دیکھ کر یہ فتویٰ دیا کہ خواہ عورت کو مہر معجل ادا کر دیا گیا ہو، اس کو اپنے وطن سے یا جہاں پر عقد ہوا ہے وہاں سے دُور دراز کے ملکوں میں جانے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ یہ فتویٰ بھی "فسادِ زمانہ" اور اخلاقی بگاڑ پر مبنی ہے اور اسی لیے یہی قول مفتی بہ قرار پایا اور قاضی اس کے مطابق فیصلے کرنے لگے۔

۴۔ فقہ حنفی کا ایک اصول یہ ہے کہ قاضی اپنے ذاتی علم کی بنا پر بھی مقدمات کا فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتا ہے یعنی متنازعہ فیہ معاملات میں محض قاضی کا علم بھی فیصلے کی بنیاد بن سکتا ہے مدعی کو اثباتِ دعویٰ کے لیے شہادت کی ضرورت نہیں ہوگی بلکہ قاضی کا علم ہی شہادت کے قائم مقام سمجھا جائے گا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے بعض فیصلے بھی اسی اصول کی نظیر کی حیثیت سے پیش کیے جاتے ہیں۔ لیکن بعد میں یہ دیکھا گیا کہ تقویٰ اور دیانت کے لحاظ سے اس پائے کے قضاۃ باقی نہیں رہے کہ ان پر اتنی زبردست ذمہ داری ڈالی جا سکے بلکہ فسادِ نیت، بددیانتی اور رشوت کی مثالیں بھی ملنے لگیں۔ علاوہ ازیں قاضیوں کے انتخاب اور تقرر میں دیانت، امانت اور صلاحیت کے بجائے حکام رسی، چاپلوسی اور خوشامد معیار بن گئی۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر متاخرین کا یہ فتویٰ ہوا کہ قاضی اپنے ذاتی علم کی بنا پر مقدمات میں فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں ہے بلکہ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ اپنا فیصلہ صرف ان مستند شہادتوں کی بنیاد پر کرے جو عدالت میں باقاعدہ پیش کی جا چکی ہوں حتیٰ کہ قاضی نے عدالت کے باہر اگر کسی معاہدے یا قرض کا معاملہ یا کسی اور واقعے کا مشاہدہ خود کیا ہو اور فریقین میں سے کوئی مدعی کی صورت میں اسی کی عدالت میں مقدمہ دائر کرے اور فریقِ ثانی مدعی کے دعویٰ کا انکار کرے تو قاضی شہادت کے بغیر فیصلہ کرنے کا مجاز نہ ہوگا۔ اس فتوے کا سبب یہ ہے کہ قاضیوں کو فسادِ نیت کے باوجود اگر ان کے ذاتی علم کی بنا پر فیصلہ کرنے کا اختیار دے دیا جائے تو اندیشہ ہے کہ وہ کسی ایک فریق کی پاسداری

کرنے لگیں اور جس کے حق میں جو چاہیں فیصلہ کر دیں۔ قاضیوں پر اس پابندی سے اگرچہ اس بات کا خطرہ ہے کہ بعض حقداروں کے حقوق شہادت فراہم نہ ہونے کی وجہ سے ان کو نہ مل سکیں لیکن دوسری طرف بہت سی غلط کاروائیوں کا انسداد اسی طریقے پر ممکن ہے۔ چنانچہ اس امر پر اب تقریباً اتفاق ہو گیا ہے کہ قاضی اگر اپنے ذاتی علم کی بنا پر فیصلہ کرے گا تو اس کا فیصلہ نافذ نہ ہو گا۔

البتہ نزاعی مقدمات کے علاوہ دیگر ایسے معاملات جو محض خیر کا پہلو رکھتے ہوں یا ان کی حیثیت انتظامی امور کی ہو یا ان کی نوعیت محض احتیاطی تدابیر کی ہو، ان میں قاضی اپنے ذاتی علم کی بنا پر کوئی اقدام کر سکتا ہے۔ مثلاً قاضی کو اگر علم ہو جائے کہ زوجین کے درمیان شرعاً جدائی ہو چکی ہے لیکن عملاً دونوں کے تعلقات منقطع نہیں ہوئے ہیں تو اسے یہ اختیار ہے کہ وہ زوجین کے درمیان عارضی طور پر تفریق کرا دے۔ اسی طرح اسے اگر کسی مال کے متعلق معلوم ہو جائے کہ وہ مال مغصوبہ ہے تو وہ اسے تا فیصلہ عدالت کسی امین کے پاس جمع کرا دینے کا اختیار رکھتا ہے۔

۵۔ مذہبِ حنفی کے مبادیات میں سے ایک اصول یہ بھی ہے کہ ایک کام اگر کسی شخص پر فرض ہو تو وہ اس فرض کی ادائیگی پر نہ کوئی اُجرت لے سکتا ہے اور نہ کسی سے ایسی اجرت کا معاملہ کر سکتا ہے اسی اصل سے یہ مسئلہ نکلتا ہے کہ اگر غاصب غصب شدہ مال کو غصب کے مقام تک واپس لانے کی اجرت طلب کرے اور اصل مالک اجرت دے دے تو غاصب کے لیے وہ اُجرت جائز نہ ہو گی اور قاضی اُجرت کو واپس دلائے گا۔ اسی طرح اگر بیوی گھر کے فرائض واجبہ کی ادائیگی سے انکار کر دے اور شوہر اس کے بدلے میں اسے تنخواہ یا اجرت دے تو یہ لین دین کا معاملہ درست نہ ہو گا اور بیوی کو اُجرت لینے کا کوئی حق نہ ہو گا۔ اسی اصول سے یہ مسئلہ بھی نکلتا ہے کہ امامت، خطبۂ جمعہ، تعلیم قرآن اور اس قسم کے فرائض دینی کی بجا آوری پر اجرت لینا جائز نہیں۔ جو ان فرائض کی انجام دہی پر قادر ہوں انہیں بلا معاوضہ یہ خدمت انجام دینی چاہیے۔ کیونکہ یہ اُس کے ذمے ایک دینی و شرعی فریضہ ہے۔

لیکن متاخرین نے دیکھا کہ ان فرائض کی ادائیگی میں لوگ بے حد سہل انگاری سے کام لینے لگے ہیں، بیت المال سے علماء کے وظائف بند ہو گئے ہیں اور وہ کسبِ معاش کی طرف اپنی توجہات

منعطف کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں، حتیٰ کہ صورتِ حال ایسی ہو گئی ہے کہ اگر ان فرائض کی ادائیگی کے لیے اُجرت قبول کرنے کی اجازت نہ دی جائے تو سرے سے ان فرائض کی بجا آوری ہی موقوف ہو جائے گی۔ اس صورتِ حال پر نگاہ رکھتے ہوئے فقہاء نے اس قسم کے فرائض پر اجرت لینے کی اجازت دے دی تاکہ تعلیمِ قرآن، علم کی نشر و اشاعت اور شعائرِ دینی کی حفاظت کا سلسلہ جاری رہ سکے۔

۶۔ فقہاء کے ہاں یہ اصول بھی مسلّم ہے کہ قانونِ شہادت کی رُو سے گواہوں کا عادل ہونا ضروری ہے اور عادل ہونے کی شرائط یہ ہیں کہ شاہد فرائض کا پابند اور صدق و امانت میں مشہور ہو۔ گواہوں کے لیے مذکورہ شرائط قرآن و سنت کی تصریحات اور فقہاء کے اجماع سے ثابت ہیں۔ لیکن فقہاء متاخرین نے یہ محسوس کیا کہ شریعت نے جس قسم کی عدالت کا مطالبہ کیا ہے وہ آج کل بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے کیونکہ زمانہ بگڑ چکا ہے، نیتوں میں فساد پیدا ہو گیا ہے اور دینی احساس میں کمی واقع ہو گئی ہے اس لیے قاضی اگر اس دور میں بھی کامل العدالۃ گواہوں کا مطالبہ کریں تو بہت سے حقدار اپنے حقوق سے محض اس وجہ سے محروم رہ جائیں گے کہ مطلوبہ شہادت فراہم کرنا ان کے لیے ممکن نہیں ہے۔ اس صورتِ حال کو مدِنظر رکھتے ہوئے فقہاء نے "الامثل فالامثل" کا اصول اختیار کر لیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ موجود ہوں ان میں سے جو بہتر سے بہتر ہو اس کی شہادت پر فیصلہ کرنا جائز ہو گا، اگرچہ وہ شہادت فی نفسہا شریعت کے معیارِ کامل کے مطابق نہ ہو۔ گویا کہ بدلے ہوئے حالات کی وجہ سے فقہاء نے "مطلق عادل" کی شرط کے بجائے "مقابلۃً عادل" ہونے کی شرط کو قبول کر لیا اور اس طرح سے ایک اصول میں اضافی اور جزوی ترمیم کر کے ایک بڑے اور اہم تر اصولِ شریعت کو پامالی سے بچا لیا۔

۷۔ اسی طرح فقہاء متاخرین نے رمضان اور عیدین کے چاند کے لیے مطلع صاف ہونے کی صورت میں صرف دو افراد کی شہادتوں کو کافی قرار دیا ہے حالانکہ قدیم مذہبِ حنفی یہ ہے کہ اگر مطلع گرد و غبار، ابر یا دھند اور کہر وغیرہ سے پاک ہو تو رویتِ ہلال کے لیے دو آدمیوں کی شہادت کافی نہیں ہے بلکہ ایسی صورت میں بہت بڑی تعداد کا چاند دیکھنا ضروری ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ بکثرت لوگ چاند دیکھنے کا اہتمام کرتے ہیں اس لیے مطلع صاف ہونے کی صورت میں صرف دو آدمیوں کا چاند

دیکھنا بعید از قیاس ہے اور ان کی شہادت میں غلطی اور شبہ کا امکان ہے۔ اس کے برعکس متاخرین نے دو آدمیوں کی شہادت قبول کر لینے کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ موجودہ زمانے میں بہت کم لوگ چاند دیکھنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ اس لیے صرف دو آدمیوں کی شہادت کو بھی رد نہیں کیا جا سکتا۔ بشرطیکہ وہ شاہد عادل ہوں اور ان کی گواہی شک و شبہ سے بالاتر ہو۔

یہ اُن بہت سے مسائل میں سے چند مسائل ہیں جن میں فقہاء کے فتوے اور قاضیوں کے فیصلے تبدیل ہو گئے ہیں۔ یہ تغیر نقطۂ نظر یا اصولِ فقہ میں کسی تبدیلی کی وجہ سے واقع نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ اس کا سبب محض زمانے کا انحطاط، عام فسادِ اخلاق، ادائے فرض میں کوتاہی اور دیانت و حق شناسی کا عمومی فقدان ہے۔

تمدن کی ترقی اور ذرائع و وسائل میں تبدیلی کے باعث احکام میں تغیر کی مثالیں

زمانے کے اخلاقی انحطاط کے علاوہ دوسری اہم شے جو احکامِ اجتہادیہ پر اثر انداز ہوتی ہے وہ معاشرتی و تمدنی حالات کی تبدیلی اور معاشی و اقتصادی وسائل کا ارتقاء ہے۔ اس کی مثالیں درج ذیل ہیں:۔

۱۔ جب تک زمینوں کی پیمائش اور ان کے نمبروں وغیرہ کا تعین نہیں ہوا تھا اس وقت تک یہ طریقہ رائج تھا کہ قابلِ فروخت جائداد اگر سامنے موجود نہیں ہوتی تھی تو بیع کی صحت کے لیے زمین کے حدودِ اربعہ کی وضاحت ضروری ہوتی تھی تاکہ وہ ملحقہ اراضی سے ممیز ہو جائے اور اس طرح سے مبیع کے معلوم ہونے کی شرط پوری ہو جائے۔ لیکن آج کل چونکہ اکثر ملکوں میں زمین کی پیمائش ہو چکی ہے، ریکارڈ کے باقاعدہ دفاتر قائم ہو چکے ہیں اور قطعاتِ اراضی کی پیمائش کے بعد ان کے نمبرات کا تعین کیا جا چکا ہے۔ اس لیے اب کسی جائداد کو فروخت کرتے وقت صرف اس کے نمبر کا ذکر کر دینا کافی ہوگا اور حدودِ اربعہ کی وضاحت کی ضرورت نہ ہوگی۔ جائدادوں کی بیع و شراء کے وقت آج کل محض ریکارڈ کے نمبروں کا ذکر کر دینا عین حکمتِ تشریع کے مطابق ہوگا۔ کیونکہ زمانے کے ترقی یافتہ ذرائع نے امتیاز کا ایک ایسا طریقہ دریافت کر لیا ہے جو تعین کے اعتبار سے حدودِ اربعہ کے مقابلہ میں سہل تر اور صحیح تر ہے۔ اگر حدودِ اربعہ کی وضاحت کو اب بھی بیع کی شرط لازم قرار دیا جائے تو یہ ایک فعلِ عبث ہوگا اور جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے شریعت میں فضول اور بیکار باتوں کی گنجائش نہیں ہے۔

۲- اسی طرح فروخت کردہ جائداد پر مشتری کو قبضہ دینے کے سلسلے میں پہلے یہ ضروری سمجھا جاتا تھا کہ بائع جائداد کا باقاعدہ قبضہ مشتری کو دلادے یا چابی وغیرہ اس کے حوالے کر دے۔ اگر بائع اس طرح مشتری کو قبضہ نہ دلائے تو جائداد بائع ہی کے قبضے میں سمجھی جائے گی اور اگر اس دوران میں جائداد تباہ ہو جائے یا اُسے کچھ نقصان پہنچے تو اس کا ذمہ دار بائع ہوگا جیسا کہ قبضہ کے بغیر بیع کی صورت میں عام فقہی قوانین کا تقاضا ہے۔ لیکن جب غیر منقولہ املاک کی رجسٹریشن کا قانون بن گیا تو قبضہ دلانے کے لیے یہ بات کافی ہو گئی کہ بیعنامہ کو رجسٹری کرا لیا جائے۔ چنانچہ قاضی اسی اصول پر فیصلے کرنے لگے کہ تاریخ رجسٹری کے بعد فروخت شدہ جائداد کی تباہی کی ذمہ داری بائع کے بجائے مشتری کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ کیونکہ رجسٹری کے ذریعہ قبضہ دلانا عملی قبضہ دلانے سے زیادہ موثر ہے۔ غیر منقولہ جائداد میں اصل اعتبار اس شخص کا ہے جس کا نام بحیثیت مالک دفتر میں درج ہو نہ کہ ان ہاتھوں کا جو اس جائداد کا انتظام کر رہے ہوں۔ جب بائع نے ایک بار اپنی جائداد کو فروخت کر کے رجسٹری کرا دی تو نہ اب کسی اور شخص کے ہاتھ وہی جائداد فروخت نہیں کر سکتا کیونکہ دفتر رجسٹرار میں اس کا نام بحیثیت مالک درج ہی نہیں ہے۔ اسی طرح حق بیع کے علاوہ باقی تمام حقوق ملکیت بھی مشتری کو رجسٹریشن کے بعد حاصل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً وہ جائداد کے منتظمین اور منصرفین کو تبدیل کرنے کا بھی مجاز ہو جاتا ہے۔ ان دلائل سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ دفتری نظم ونسق میں ترقی کے باعث یہ چیز درج شریعت کے بالکل مطابق ہے کہ بیعنامہ کی رجسٹری عملی قبضہ دلانے کے قائم مقام قرار دی جائے۔

یہ اور اس طرح کی دوسری مثالوں سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ تغیر زمانہ سے تغیر احکام کے اصول کو محض "عرف عام" کے نظریہ پر محمول کرنا درست نہیں ہے، جیسا کہ بعض محققین نے کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ قاعدہ درحقیقت "مصالح مرسلہ"[1] کے اصول سے ماخوذ ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ فرائض کی ادائیگی میں پہلو تہی، نیتوں کا فساد، تقویٰ کا فقدان، طمع کی کثرت، اختراع ... جدیدہ اور تمدن کی ترقی وغیرہ

[1] "مصالح مرسلہ" ایک فقہی اصطلاح ہے جس کے تحت تشریع اور قانون سازی کا وہ حصہ آتا ہے جو اسلام اور مسلمانوں کے عمومی مفاد و مصلحت کا لحاظ رکھ کر سرانجام دیا جاتا ہے۔

امور "عرفِ عام" کی قسم کی چیزیں نہیں ہیں کہ جن کی بنیاد پر لوگ عام طور سے آپس میں معاملہ کرتے ہوں، بلکہ درحقیقت ان میں سے بعض اخلاقی زوال کا نتیجہ ہیں اور بعض تمدن کی ترقی کا تقاضا ہیں اور یہ دونوں امور ان اجتہادی احکام کو، جو مخصوص حالات کے لیے وضع کیے گئے تھے، بدلے ہوئے حالات میں ناقابلِ عمل بنا دیتے ہیں۔ کیونکہ ان سے شریعت کے مقاصدِ اولیہ فوت ہونے لگتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ ان اجتہادی احکام کو تبدیل کر کے انہیں ضروریاتِ زمانہ کے مطابق بنایا جائے تاکہ شریعت کے اصل مقاصد پورے ہو سکیں۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ اگر بادبانی کشتی کو کسی خاص سمت میں لے جانا ہو تو اس کے بادبان کا رُخ اُس خاص سمت پر اس طرح رکھا جائے گا کہ کشتی مطلوبہ سمت میں حرکت کر سکے لیکن جب ہوا کا رُخ بدل جائے تو بادبان کے رُخ کو بھی اُسی طرف بدلنا پڑے گا تاکہ کشتی مطلوبہ سمت میں سفر کرتی رہے ورنہ یا تو کشتی کا رُخ منزلِ مقصود کی طرف سے پھر جائے گا یا کشتی ایک ہی جگہ کھڑی ہو جائیگی اور یہ ظاہر ہے کہ اصل مقصود کشتی کو ایک مقام مطلوب تک پہنچانا ہے نہ کہ بادبان کا کسی خاص رُخ پر رکھنا۔

علامہ ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "نشر العرف" میں لکھا ہے کہ "بہت سے احکام زمانے کے اختلاف کے باعث بدل جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض میں تبدیلی "عُرف" کے بدل جانے کے سبب سے ہوتی ہے، بعض میں کسی نئی ضرورت کے پیش آجانے کے سبب سے ہوتی ہے اور بعض میں تبدیلی کا سبب زمانے کا فساد ہوتا ہے۔ مذکورہ اسباب کی وجہ سے احکام میں تبدیلی اس لیے ہوتی ہے کہ اگر احکام کو علیٰ حالہٖ باقی رکھا جائے تو اس کی وجہ سے لوگوں کو بڑی مشقت اور نقصان کا سامنا کرنا پڑے گا اور یہ چیز شریعت کے اصول "تیسیر و تخفیف" اور "دفع ضرر و فساد" کے خلاف ہوگی۔ اسی لیے فقہاء نے بہت سے مواقع پر اپنے مذہب کے امام کی تصریحات سے اختلاف کیا ہے، کیونکہ امام کی رائے ان معاملات میں اپنے زمانے کے حالات کے مطابق تھی اور خود امام کے مقرر کردہ اصولِ فقہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر امام اس بدلے ہوئے زمانہ میں ہوتے تو ان کا فتویٰ بھی وہی ہوتا جو موجودہ دور کے فقہاء کا ہے"۔

امام شہاب القرافی نے بھی اپنی کتاب "الفروق" میں فرق ۲۸ کے تحت لکھا ہے کہ "منقولات پر ہر حال میں جمے رہنا دینی گمراہی کی ایک قسم ہے اور یہ علماء اور سلف صالحین کے پیشِ نظر مقاصد سے ناواقفیت

اور جہالت کا کھلا ہوا ثبوت ہے"۔

علامہ ابن القیم علیہ الرحمتہ نے "اعلام الموقعین" ج ۳ ص۱ پر "زمان و مکان، احوال و عادات اور نیات میں تبدیلی کے باعث فتویٰ میں تبدیلی" کے عنوان کے تحت لکھا ہے: "فتویٰ میں تبدیلی کا یہ بڑا اہم اصول ہے۔ جو لوگ اس کی حقیقت کو نہیں جانتے وہ شریعت کے بارے میں زبردست غلطیوں کا ارتکاب کرتے ہیں، جن کی وجہ سے لوگوں کو ناقابلِ برداشت تنگی، مشکلات اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ شریعت جس نے مصالح کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے اس قسم کی تنگی کو پسند نہیں کر سکتی؛ کیونکہ شریعت کی بنیاد حکمت اور عوام الناس کے دینی اور دنیوی مصالح پر رکھی گئی ہے۔ بلکہ شریعت تو مجسم عدل و انصاف، یکسر رحم و ہمدردی اور سراسر مصلحت و حکمت ہے۔ اس لیے ہر وہ مسئلہ جو انصاف کے بجائے ظلم و زیادتی کا، رحم کے بجائے سختی و نامہربانی کا اور مصلحت و حکمت کے بجائے مفاسد و لغویات کا سبب بن جائے وہ ہرگز شریعت کا مسئلہ نہیں ہو سکتا خواہ تاویل کر کے اسے نظامِ شریعت میں زبردستی ٹھونس دیا جائے"۔

حضرات علماء کرام کی خدمت میں چند سوالات

(جناب خان محمد صاحب ربانی)

گزشتہ عیدالاضحیٰ کے موقعہ پر جماعت اسلامی ملتان شہر کی طرف سے خیراتی شفاخانہ کے لیے قربانی کی کھالیں جمع کرنے کی ایک مہم شروع کی گئی تھی۔ بعض مخالفین نے اس مقصد کو نقصان پہنچانے کے لیے ملتان کے مقامی علماء سے ایک استفتاء کیا جس میں زکوٰۃ، فطرانہ، قیمت چرم ہائے قربانی وغیرہ صدقاتِ واجبہ کے مصرف کے بارے میں یہ پوچھا گیا کہ مساجد و مدرسہ جات اور رفاہِ عام کے دوسرے اداروں پر ان رقوم کو خرچ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اور اس سلسلہ میں جماعت کے شفاخانوں کے مصارف یعنی ادویات کا خرچ، طبی عملہ کی تنخواہیں، موٹر کی مرمت، ڈرائیور کے معاوضہ اور پٹرول کی قیمت پر ان رقوم کے خرچ کے جواز کے بارے میں بھی سوال کیا گیا تھا۔

فتویٰ تحریر کرنے والے مفتی صاحب نے وضاحت سے تمام سوالات کا جواب دینے کے بجائے مجملاً یہ لکھ دیا کہ ان سوالات میں جتنے مصارف مذکور ہیں، تقریباً سب میں تملیکِ شرعی نہیں پائی جاتی۔ لہٰذا زکوٰۃ، فطرانہ، قیمت چرم ہائے قربانی وغیرہ کو ایسے مصارف میں صرف کرنا ناجائز ہے۔ اس جواب پر باقی مقامی علماء نے صاد کر دیا۔ اور مستفتی نے اسے شائع کر کے عام لوگوں میں پھیلا دیا۔ تاکہ عوام الناس استفتا اور فتوے کی غیر واضح عبارت سے اس دھوکا میں آجائیں کہ خیراتی شفاخانے کے لیے چرم ہائے قربانی، زکوٰۃ اور صدقات کی رقوم دینا ناجائز ہے۔

بہرحال علماء کرام کے اس فتوے سے بالعموم لوگوں کے ذہنوں میں ایک الجھن سی پیدا ہو گئی ہے۔ اور مختلف حلقوں میں مختلف قسم کے اعتراضات اور سوالات اُٹھائے جا رہے ہیں۔ ذیل میں ان اعتراضات اور سوالات کا ایک خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔ اور ان مذکورہ بالا علماء سے خصوصاً اور دوسرے اکابر علماء سے عموماً یہ گذارش کی جاتی ہے کہ براہِ کرم اس مسئلے کو اچھی طرح صاف کر دیں۔ تاکہ آئندہ ہر بقر عید کے موقعہ پر اس قسم کے فتوے اور اشتہار نکلنے سے خواہ مخواہ دیندار طبقوں کو پریشانی پیش نہ آئے اور بے دین طبقوں

کو دین اور اہلِ دین کا مذاق اڑانے کے مواقع نہ ملیں۔

بنیادی اعتراض یہ ہے کہ فقہ حنفی میں زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے تملیک کی جو شرط لگائی ہے اور اس شرط کی بنا پر جو فروعی احکام علما اور فقہا اپنے فتووں میں بیان کرتے ہیں وہ صرف اسی صورت میں قابلِ عمل ہیں جبکہ لوگ انفرادی طور پر اپنی زکوٰۃ نکال کر انفرادی طور پر ہی اس کو صرف کر دیں لیکن اگر اجتماعی طور پر مثلاً اسلامی حکومت کے ذریعہ سے اس کو وصول اور صرف کرنے کا انتظام کیا جائے تو یہ شرط اپنے ان جزئی احکام کے ساتھ ایک دن بھی نہیں چل سکتی۔

قرآن و حدیث سے یہ ثابت ہے کہ زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کے لیے صحیح صورت اجتماعی تنظیم ہی ہے۔ نہ کہ انفرادی طور پر زکوٰۃ نکالنا اور بطور خود تقسیم کر دینا۔ یہ آخری صورت تو محض اس مجبوری کی حالت کے لیے ہے جبکہ مسلمانوں کے اندر کوئی اجتماعی نظم اس خدمت کی انجام دہی کے لیے موجود نہ ہو۔ ورنہ شریعت کا منشا یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا انتظام اجتماعی طور پر ہونا چاہیے۔ جیسا کہ آیت انما الصدقات للفقراء والمساکین الخ میں والعاملین علیہا کی قید رکھنے سے معلوم ہوتا ہے، اور جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور نے زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کا باقاعدہ نظم قائم فرمایا تھا اور جیسا کہ حضرت ابو بکرؓ کے اس فعل اور صحابہ کے اس پر اجماع سے معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے اسلامی حکومت کو زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کیا ان کے خلاف جنگ کی گئی۔

اب اگر یہ مسلم ہے کہ زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کے لیے صحیح صورت اجتماعی تحصیل و تقسیم ہی ہے تو براہِ کرم یہ بتایا جائے کہ اس اجتماعی نظم کی صورت میں تملیک کی یہ شرط اپنے جزئی احکام کے ساتھ کیسے قابلِ عمل ہو سکتی ہے؟ اس سوال کی توضیح کے لیے ہم چند عملی مسائل پیش کر کے علماء سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ان کا جواب عنایت فرمائیں۔

۱۔ زرعی پیداوار اور مواشی کی زکوٰۃ ظاہر ہے کہ ایک ایک گاؤں اور ایک ایک چراگاہ سے وصول کی جائے گی۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس طرح زکوٰۃ میں جو مختلف قسم کے حبوب، غلے اور جانور وصول ہوں گے وہ اسی وقت، اسی جگہ، اسی شکل میں مقامی مستحقین کے درمیان سب کے سب تقسیم نہیں ہو جائیں گے، ان

کے بہت بڑے حصے کو تحصیل، ضلع یا صوبے کے مرکزی بیت المال میں منتقل کرنا ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ ان اشیاء کے حمل و نقل کے لیے جو چھکڑے، لاریاں اور ٹرک وغیرہ استعمال کیے جائیں گے، اُن کی قیمت، اُن کے ڈرائیوروں کی تنخواہیں، اُن کے پٹرول وغیرہ کے مصارف آیا زکوٰۃ ہی کی مد سے دیئے جائیں گے یا کسی اور مد سے؛ اور مرکزی مقامات کے بیت المالوں میں ان چیزوں کو رکھنے کے لیے جو ڈپو، ذخیرہ گاہیں اور جانوروں کے باڑے تعمیر کیے جائیں گے اُن کا خرچ اور اُن کے کارکنوں کا خرچ کس مد سے ادا کیا جائے گا؛

۲۔ زیورات، سونے چاندی، تجارتی اموال اور کارخانوں اور کمپنیوں وغیرہ کی جو زکوٰۃ مُلکاً یا طوعاً مختلف مقامات سے وصول ہوگی وہ بھی لازماً ساری کی ساری اُسی جگہ صرف نہیں ہو جائے گی جہاں سے وہ وصول ہوگی۔ اُس کا اچھا خاصہ حصہ بھی لامحالہ اُن مراکز پر منتقل کیا جائے گا جو زکوٰۃ جمع کرنے کے لیے مقرر کیے جائیں گے۔ اس دولت کو منتقل کرنے کے مصارف کس مد سے ادا کیے جائیں گے؟ کیا مثلاً ڈاک خانے کو منی آرڈر کی فیس ادا کرنا زکوٰۃ کا صحیح مصرف ہوگا؟ یا جو لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ خزانے کی رقمیں لے جائیں گے وہ ریل کا کرایہ زکوٰۃ کی مد سے لے سکیں گے؟

۳۔ پھر جو زرِ نقوم، اجناس اور مواشی اس طور پر جمع ہوں گے کیا یہ لازم ہوگا کہ ان میں سے ہر چیز کو اسی شکل میں تقسیم کر دیا جائے جس شکل میں وہ وصول ہو؟ کیا مواشی کو بیچ کر اُن کی قیمت بیت المال میں جمع کر لینا یا ضرورت سے زائد چاول فروخت کر کے حسبِ ضرورت گندم خرید لینا۔ یا وصول شدہ کپاس کو قابلِ استعمال روئی میں تبدیل کرا لینا یا روغنی بیجوں کا تیل نکلوا کر رکھنا شرعاً ممنوع ہوگا؟ اگر یہ ممنوع نہیں ہے تو ان مختلف کاموں کے مصارف کون ادا کرے گا اور کس مد سے ادا کرے گا؟

۴۔ فرض کیجیے کسی علاقے میں قحط برپا ہے اور حکومت پورے ملک کی فاضل زکوٰۃ اس قحط زدہ علاقے کے محتاج لوگوں پر صرف کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں اسے پہلا کام تو یہ کرنا ہوگا کہ تمام بیت المالوں کے ذخائر میں سے جمع شدہ غلّہ وہاں بھیج دے۔ لیکن یہ اس کے بغیر نہ ہو سکے گا کہ زکوٰۃ کی مد سے ہزاروں روپے اس غلّے کو منتقل کرنے کے لیے ریلوں اور ٹرکوں اور حمالوں کی مزدوریوں اور بوریوں کی قیمت پر صرف کیے جائیں۔ پھر جب یہ غلّہ بھی کافی نہ ہوگا۔ تو حکومت کو وہاں مزید غلّہ بھیجنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ اس

صورت میں تملیک کی شرط کا منشا تو یہ ہے کہ غلہ کسی اور مد سے خرید کر وہاں بھیجا جائے اور ایک ایک قحط زدہ آدمی کو زکوٰۃ کا روپیہ دے کر اس سے کہا جائے کہ اب تجھے اختیار ہے، چاہے غلہ خرید لے اور چاہے کسی اور مد میں استعمال کرے لیکن قابل عمل صورت صرف یہ ہے کہ زکوٰۃ کی مد سے مختلف علاقوں اور ملکوں کا غلہ خرید خرید کر وہاں بھیجا جائے اور قحط زدہ لوگوں میں نہ صرف غلہ تقسیم کیا جائے بلکہ روٹیاں تک پکوا کر تقسیم کی جائیں تاکہ بھوک سے مرتے ہوئے آدمیوں کو بروقت تیار شدہ غذا مل سکے۔ کیا ایسا کرنا تملیک کی شرط کے ساتھ ممکن ہوگا؟ پنجاب و بنگال کے موجودہ سیلاب میں اگر زکوٰۃ کے بیت المال سے کوئی مدد پہنچائی جاتی تو تملیک کی شرط کے ساتھ کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سوائے اس کے کہ روپیہ سیلاب زدہ لوگوں میں تقسیم کر دیا جاتا۔ اور ان سے کہا جاتا کہ اب اپنی ضروریات جہاں سے ملیں فراہم کر لو۔ حالانکہ ضرورت کی تمام اہم چیزیں بروقت صرف اسی طرح پہنچ سکتی ہیں کہ ہوائی جہازوں پر سامان، دوائیں اور کارکن بھیجے جائیں۔

۵۔ زکوٰۃ کے مستحقین میں سے ایک قسم کے مستحق مسافر بھی ہیں تملیک کی شرط کا تقاضا یہ ہے کہ ہر مسافر کو زکوٰۃ کی مد سے روپیہ دے دیا جائے۔ اور اس سے کہا جائے کہ جہاں سر چھپانے کو جگہ مل جائے، جا پڑ رہو جہاں سے کھانا مل سکے خرید کر کھا لے۔ اس شرط کے ساتھ یہ ممکن نہیں ہے کہ مسافروں کے لیے مختلف مقامات پر مسافر خانے بنوائے جا سکیں۔ وہاں ان کے لیے ٹھیرنے اور کھانے کا انتظام کیا جا سکے جس کے پاس بستر نہ ہو اس کو بستر دیا جا سکے اور جو بیمار ہو اس کو طبی امداد بہم پہنچائی جا سکے۔

۶۔ زکوٰۃ کے مستحقین میں یتیم بچے بھی شامل ہیں۔ جن میں بکثرت ایسے چھوٹے بچے بھی ہو سکتے ہیں جو خود اپنی کوئی ضرورت بھی پوری کرنے پر قادر نہ ہوں۔ خصوصاً قحط، وبا، سیلاب، جنگ وغیرہ کی صورت میں ہزارہا صغیر السن بچوں کی کفالت حکومت کے ذمے آ پڑے گی۔ تملیک کی شرط کے ساتھ ان بچوں پر زکوٰۃ کا ایک پیسہ بھی صرف نہیں کیا جا سکتا۔ ان بچوں کی کفالت اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ وہ ایسی پرورش گاہوں میں رہیں جہاں ان کی نگہداشت، ان کی غذا، ان کے لباس، ان کے علاج، ان کی تعلیم و تربیت وغیرہ کا سارا انتظام حکومت کی طرف سے ہو۔ لیکن تملیک کی شرط کے ساتھ نہ کوئی پرورش گاہ تعمیر کی جا سکتی ہے، نہ اس کے عملے کی تنخواہیں دی جا سکتی ہیں اور نہ بچوں کی ضروریات کے لیے کسی قسم کا

سامان خریدا جا سکتا ہے۔ تملیک کی شرط کہتی ہے کہ ہر بچے کو زکوٰۃ کا روپیہ دے کر اُس کا مالک بنا دو پھر یہ اسکی مرضی پر موقوف ہے کہ اپنی ضروریات جس طرح چاہے پوری کرلے۔ یعنی سال بھر کا بچہ جو کسی قحط زدہ علاقے میں سڑک پر پڑا ہُوا ملا تھا اُسے روپے دے دیئے جائیں کہ کسی آتی جاتی لاری میں بیٹھ کر شہر چلا جا اور اپنے لیے کوئی انّا ڈھونڈ کر نوکر رکھ لے۔ ماہوار وظیفہ بیت المال تجھے دیتا رہے گا۔

۷۔ زکوٰۃ کے مستحقین میں وہ بیمار اور معذور لوگ بھی شامل ہیں جو اپنے علاج اور اپنی کفالت کے ذرائع نہ رکھتے ہوں۔ تملیک کی شرط کے ساتھ زکوٰۃ کی مد سے صرف انہی بیماروں اور معذوروں کی مدد کی جا سکتی ہے جو روپیہ لے کر خود اپنے علاج یا اپنی ضروریات کی فراہمی کا انتظام کر سکتے ہوں، یا جن کے اقارب یا ہمدردان میں کوئی ایسا ہو جو روپیہ مل جانے کی صورت میں اُن کے لیے یہ انتظام کر سکے۔ لیکن جس بیمار یا اپاہج کا کوئی پرسانِ حال نہ ہو اور جس کے لیے خود دوڑ دھوپ کرنا بھی مشکل ہو، وہ زکوٰۃ کا روپیہ لے کر کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔ ایسے بیکس مریض کے لیے تو ناگزیر ہے کہ کوئی اُسے اُٹھا کر امبولنس کار پر ہسپتال لے جائے اور وہاں اُس کے لیے دوا، علاج، غذا، لباس اور تیمارداری کا پورا انتظام کیا جائے۔ اسی طرح ایسے بیکس اپاہج کے لیے محتاج خانے کی ضرورت ہے جہاں اسکی تمام ضرورتیں پوری کرنے کا انتظام ہو۔ مگر تملیک کی شرط ان میں سے کوئی انتظام بھی زکوٰۃ کی مد سے نہ کرنے دے گی۔ نہ کوئی امبولنس کار اس شرط کے ساتھ استعمال ہو سکتی ہے، نہ معالجوں اور تیمارداروں کا کوئی عملہ رکھا جا سکتا ہے، نہ کوئی محتاج خانہ قائم کیا جا سکتا ہے اور نہ خوراک، لباس اور دوائیں خرید کر مہیا کی جا سکتی ہیں۔ آپ کی اس شرط کا تقاضا یہ ہے کہ ہر ایسے مریض یا معذور کو زکوٰۃ دے کر اس کا مالک بنا دیا جائے اور پھر وہ ان میں سے ہر چیز کے مصارف خود اس رقم میں سے دیتا رہے۔

اس طرح کے اور بہت سے عملی سوالات ہیں جو اجتماعی تنظیم کے ساتھ زکوٰۃ وصول اور خرچ کرنے کی صورت میں تملیک کی شرط پر اصرار کرنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ مگر ہم نے صرف چند سوالات اس لیے پیش کیے ہیں تاکہ علماء ان پر غور کرکے یا تو ہمیں یہ بتائیں کہ تملیک کی شرط برقرار رکھتے ہوئے ان مسائل کا کیا حل ہے، یا پھر آئے دن فقہ حنفی کے نام سے اس قسم کے فتوے شائع کر کرکے خواہ مخواہ لوگوں کے

دلوں میں شریعت کے متعلق بدگمانیاں پیدا نہ فرمایا کریں اور نہ کام کرنے والوں کے راستے میں بلاوجہ رکاوٹ ڈالیں۔ واقعہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانے میں جب زکوٰۃ کی اجتماعی تنظیم خود حکومت کر رہی تھی، زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے تملیک قطعاً شرط نہ تھی۔ اس کے شرط ہونے کا اس زمانے میں کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ یہ شرط فقہاء نے بعد کے زمانے میں عائد کی ہے جبکہ اجتماعی تنظیم ختم ہو چکی تھی اور لوگ اپنی اپنی زکوٰۃ بطور خود نکال کر خرچ کرنے لگے تھے۔ اس وقت یہ شرط عائد کرنا بلاشبہ ضروری تھا، کیونکہ اس کے بغیر یہ اندیشہ تھا کہ زکوٰۃ کا بڑا حصہ غلط مصارف میں صرف ہو جائے گا، یا غیر مستحق لوگوں کو پہنچنے لگے گا۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اجتماعی تنظیم کی شکل میں بھی بیجا مصرف کے بہت سے خطرات ہیں۔ مگر اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ آپ تملیک کی شرط پر اصرار کر کے زکوٰۃ کی اجتماعی تحصیل و تقسیم ہی کو سرے سے ناممکن بنا دیں۔ بلکہ اس کا علاج یہ ہے کہ جہاں کوئی بیجا صرف ہو رہا ہو اس کی نشان دہی کیجیے اور دلیل و ثبوت کے ساتھ تنقید کر کے اس کی اصلاح کے لیے کوشش فرمایئے۔

رسائل و مسائل

کیا لاشے بات سنتے ہیں؟

سوال: ایک حدیث میں ابی طلحہؓ روایت کرتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جنگ بدر میں کفار کو شکست دینے کے بعد ۲۴ مقتول سرداران کفار کو ایک گندے اور گہرے گڑھے میں پھنکوا کر ان سے خطاب فرمایا کہ اے سرداران قریش جو وعدہ خدا نے ہم سے کیا تھا وہ اس نے پورا کر دیا، کیا وہ وعدہ جو خدا نے تم سے کیا تھا وہ بھی پورا ہو گیا؟ فقال عمرؓ "یا رسول اللہ! ما تکلم من اجساد لا ارواح لہا" اے خدا کے رسول! کیا آپ ایسے لاشوں سے گفتگو فرما رہے ہیں جن میں ارواح باقی نہیں؟ آنحضور صلعم نے جواباً فرمایا: "والذی نفس محمد بیدہ ما انتم باسمع منہم ولکن لا یجیبون" قسم اس ذات کی جس کے دست قدرت میں محمدؐ کی جان ہے۔ تم (میری اس گفتگو کو) ان سے زیادہ سننے والے نہیں ہو، لیکن وہ جواب نہیں دے سکتے" (متفق علیہ۔ بخاری و مسلم)

اب آپ قرآن شریف کی طرف بنظر غائر دیکھیں اور میرے شبہ کو دور فرمائیں۔ قرآن شریف میں ہے:۔ "وما انت بمسمع من فی القبور (اور آپ قبروں کے گڑھے مُردوں کو سنانے پر قادر نہیں ہیں)۔ دوسری جگہ ہے: فانک لا تسمع الموتیٰ ولا تسمع الصم الدعاء اذا ولوا مدبرین (سو آپ مردوں کو سنا سکنے والے نہیں ہیں، اور نہ بہروں کو اپنی پکار سنا سکنے والے ہیں جبکہ وہ روگردانی کر رہے ہوں)" او کالذی مر علیٰ قریۃ کا واقعہ صاف دلالت کر رہا ہے کہ یہ مردے نہیں سنتے۔ یہ واقعہ حضرت عزیر علیہ السلام یا کسی اور نبی کا ہے۔ اگر وہ نبی سن سکتے تو سو سال کے طویل عرصہ میں ہزاروں آوازیں آتیں۔ ان کا گدھا ان کے پاس چیخ چیخ

کرمر گیا لیکن وہ نہ سن سکے جب ایک پیغمبر نہ سن سکا تو دوسرے لوگ کیسے سن سکتے ہیں۔ اصحاب کہف بھی اللہ کے نیک بندے تھے تین سو نو سال غار میں پڑے رہے، اور پھر جب خدا نے ان کو زندہ کیا تو انہوں نے بھی تین سو نو سال کے طویل عرصہ کو چند گھنٹے خیال کیا۔ اب آپ ہی انصاف فرمائیں کہ قرآن و حدیث میں کس قدر تعارض و تضاد ہے۔

ممکن ہے کہ آپ مجھے منکر حدیث خیال کرتے ہوئے جواب دینے کی زحمت گوارا نہ فرمائیں لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے صحاح ستہ اور کتب فقہ و تفسیر، اصول منطق، ادب و نحو وغیرہ باقاعدہ اسلامی درسگاہوں میں حاصل کیے ہیں۔ بفضل خدا میں حنفی ہوں۔ لیکن اب دوبارہ قرآن و حدیث کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ اگر آپ نے مجھے قابلِ التفات نہ سمجھتے ہوئے میرے شبہات کا ازالہ نہ کیا تو شاید میں ان حدیثوں کو ماننے سے انکار کر دوں جو قرآن کے مخالف ہیں۔

جواب ۔ آپ اگر خدانخواستہ منکرِ حدیث ہوتے تو بھی آپ کے کسی سوال کا جواب اس صورت میں ضرور دیا جاتا جبکہ اس میں ابتغائے فتنہ اور نامعقولیت کے آثار نہ ہوتے۔ اخلاص کے ساتھ حق کی جستجو کرتے ہوئے اشکال اور شبہات کا پیش آنا اور ان کا حل تلاش کرنا اور چیز ہے اور فاسد ذہن کے ساتھ خواہ مخواہ الجھنیں پیدا کر کے اور دوسروں سے حجت بازی کرنا اور مناظرانہ اسلوب کے ساتھ بدزبانی پر اتر آنا بالکل دوسری صورت ہے۔ پہلی حالت سے سابقہ پڑے تو اپنی استطاعت کے مطابق فہم حق میں ہم ہر مسلمان کو مدد دیتے ہیں، دوسری صورت درپیش ہو تو ہم فضولیات کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ ان مشاغل کے لیے ہمارے پاس نہ وقت ہے، نہ توتیں!

پورے شعور کے ساتھ قرآن و حدیث کا جو تقابلی مطالعہ آپ نے شروع کیا ہے یہ بہت قابل قدر ہے درسگاہوں سے بہت سے فارغ التحصیل علماء ہر سال الفاظ کے انبار کے انبار اور نحو و ادب اور تفسیر و فقہ کی معلومات کے طومار کے طومار دماغ پر لادے اس حالت میں نکلتے ہیں کہ دین کی روح، اس کی حکمت اور اس کے اصولی مسائل کا کوئی شعور ان میں موجود نہیں ہوتا۔ چنانچہ بجائے اس کے کہ یہ علم ان کو حقیقت کے قریب لے جائے الٹا دور ہٹاتا ہے اور وہ یا تو جمود کے کسی غار میں کھو جاتے ہیں، یا فتنہ پیدا

کرتے پھرتے ہیں، یا پھر فتنہ گروں کے کسی طلسم میں پھنس کر رائگاں عمریں گذار دیتے ہیں۔

منکرینِ حدیث نے خدا کے دین کے خلاف جو مہم شروع کر رکھی ہے وہ یہ تاثر پیدا کرتی ہے کہ فی الجملہ احادیث قرآن سے متعارض ہیں، اور احادیث نے دفتر ایک سازش کے طور پر مدون کر کے دین کا جزو بنا دیے گئے ہیں۔ حالانکہ پوزیشن بالکل برعکس ہے۔ فی الجملہ ذخائرِ احادیث ایمان و حکمت کے جواہرِ بے بہا کے خزائن ہیں۔ علم کے ان درخشاں موتیوں میں سے ایک ایک کی قدر و قیمت کی گواہی قرآن خود دیتا ہے۔ کہیں اکا دکا کوئی سنگ ریزہ بھی ان میں باوجود چھان پھٹک کے باقی رہ گیا تو رہ گیا۔ ایسے سنگ ریزوں کو روایت و درایت، اور قرآن اور سنت کے مجموعی شعور کی کسوٹیوں کے ذریعے الگ کیا جا سکتا ہے۔

یہ مہم جس فنِ لطیف کے ساتھ چلائی جا رہی ہے وہ اپنے اندر بڑے دلچسپ انداز رکھتا ہے۔ حدیث پر حملہ کے حسبِ ذیل طریقے اختیار کیے گئے ہیں:۔

—— وہ روایات جن کے بارے میں پہلے سے ہمارے علماء و ائمہ کی تحقیق یہ ہے (اور اس کا تحریری ریکارڈ موجود ہے) کہ فلاں فلاں روایات ضعیف یا ناقابلِ استناد ہیں، ان کو نمک مرچ لگا کر سامنے لایا جاتا ہے۔

—— وہ روایات جن پر محققین نے خود ہی اعتراضات وارد کر کے پھر ان کے جواب دینے کے بعد ان کی پوزیشن صاف کر دی ہے، ان میں سے بعض کو لے کر محققین کے اٹھائے ہوئے اعتراضات کا حصہ، کبھی حوالوں کے ساتھ اور کبھی اپنی طرف سے پیش کر کے جواب کا حصہ نگاہوں سے اوجھل چھوڑ دیا گیا ہے۔

—— وہ روایات جن سے قرآن کے مطابق کوئی مفہوم اخذ ہونے کے ساتھ کوئی مکروہ قسم کی تاویل کی جا سکتی ہو، ان کے لیے قرآنی مفہوم کو دانستہ پیچھے ڈال کر ایک مکروہ تاویل کو ابھار دیا جاتا ہے۔

—— ایسی افسوسناک مثالیں بھی موجود ہیں جن میں ایک حدیث کے اندر لغت و ادب اور دوسری ساری پابندیوں سے بے نیاز ہو کر ایک نامعقول مفہوم اپنی طرف سے داخل کر دیا گیا ہے۔

اس طرح اثر یہ پیدا کیا جا رہا ہے کہ فی الجملہ احادیث کے خزائن میں کھوٹا مال بھرا پڑا ہے اور جو اس اثر میں آجاتا ہے وہ احادیث پر پہلی نگاہ اعتماد کی نہیں، شک و شبہ کی ڈالتا ہے۔ آپ کے دونوں سوالات کو سامنے رکھنے سے یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اس طرح کا زاویۂ نظر آپ کے اندر نہ ابھر رہا ہو۔ یہ زاویۂ نظر اگر ایک بار پیدا ہو جائے اور ایک ایک حدیث کو آدمی مشکوک قرار دے کر اسے زیرِ بحث لانے کے چکر میں پڑ جائے تو اس کی ساری عمر گذر جائے گی لیکن سنتِ نبوی اور اسوۂ حسنہ کے بارے میں مجموعی حیثیت سے وہ ایمان کبھی نصیب نہ ہوگا جس کے بغیر اطاعتِ رسول صلعم کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔[1]

آپ منکرینِ حدیث کے پروپیگنڈے میں سے تجزیہ کر کے وہ اصولی اختلاف برآمد کریں جو حیثیتِ مجموعی ان کو نظامِ دین و شریعت سے ہے اور پھر اس اختلاف کے اصولی حیثیت سے اِدھر یا اُدھر کسی ایک طرف ختم کر کے یکسو ہوں۔ اگر آپ یہ تسلیم کریں کہ سنتِ رسولؐ ماخذِ شریعت ہے اور یہ مانیں کہ حدیث سنتِ نبوی کا زیادہ سے زیادہ حد تک قابلِ اعتماد ریکارڈ ہے تو پھر فی الجملہ اس ریکارڈ کو بھروسے کے ساتھ لیں اور اسے ایمان و حکمت حاصل کرنے کے لیے پڑھیں۔ جہاں کہیں کھٹک پیدا ہو، وہاں محدثین کی کتابوں اور اہلِ علم سے مدد لے کر معلوم کریں کہ کسی روایت کا اسنادی درجہ کیا ہے اور اس کے مفہوم کی تاویلِ احسن کیا ہو سکتی ہے جو اسے قرآن و سنت کے فریم میں کسی ٹھیک مقام پر نصب کر دے۔ ان مراحل کو طے کر جانے پر بھی اگر ایک روایت قرآن سے تضاد رکھتی ہو تو حق یہی ہے کہ اسے بالائے

---

[1] یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی شخص کو کوئی فتنہ گر آ کر یہ کہے کہ تو جس مکان میں رہتا ہے وہ تیرے باپ نے تمام تر حرام کمائی سے بنایا ہے اور پھر وہ کبھی اس کی کسی اینٹ کے بارے میں یہ شبہ پیدا کرے کہ یہ مال مسروقہ ہے اور کبھی اس کی کسی کڑی کے بارے میں یہ شک پیدا کرے کہ یہ فلاں جگہ سے غصب کر کے لائی گئی ہے۔ مخاطب اگر سلیم الدماغ ہو تو وہ پہلے یہ طے کریگا کہ اس کا باپ حرام خور تھا بھی یا نہیں اور اگر اسے یقین ہوگا کہ اس کا باپ حلال کی حدود کا پابند تھا تو وہ ایک ایک اینٹ اور ایک ایک کڑی کے بارے میں شبہات میں مبتلا ہونے کے بجائے فتنہ گر کو دھتکار کر اپنے کام میں لگ جائیگا۔ لیکن ایک سادہ لوح اگر فتنہ گر کے چکر میں آگیا تو وہ اینٹوں اور کڑیوں میں سے ایک ایک کی تفتیش میں پڑ کر اپنی پوری عمر صرف کر بیٹھے گا اور کرنے کا کوئی کام اس کے ہاتھوں نہ ہو سکے گا۔

طاق رکھ دیں۔ نہ یہ کہ جو حدیث اپنے جی کو نہ لگی، یا جس کے مفہوم کو سمجھنے میں کوئی دقت پیش آئی اس پر جھٹ سے قرآن سے تضاد رکھنے کی مہر لگا دی۔

اب آئیے اصل بحث کی طرف۔ جس روایت کو آپ نے پیش کیا ہے وہ سمع موتیٰ کی بحث سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔ یہ مسئلہ جھگڑے کے اختلافی مسئلوں میں سے ایک ہے اور اسے مناظرہ آرائوں نے خوب خوب رگیدا ہے۔ ان جھگڑوں کی وجہ سے خود یہ اور اس سلسلے کی دوسری روایات بھی اختلافات کا اکھاڑا بن گئی ہیں لیکن حقیقت قرآن اور حدیث دونوں کی رُو سے بالکل صاف ہے۔

عالم برزخ سے گذرنے والوں کو جو احوال و کوائف پیش آتے ہیں ان کو قرآن اور حدیث کی جملہ تفصیل کی روشنی میں زیر غور لائیے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ سب معاملات اجساد سے نہیں ارواح سے متعلق ہیں، اور ارواح کے معاملات کو زمان و مکان کے اُن تصورات کی عینک سے دیکھنا مغالطہ پیدا کرتا ہے جو ہماری موجودہ مادّی زندگی میں ہمارے ذہن پر مسلط ہیں۔ ہم عالم برزخ کی خبروں کو اسی مادّی زندگی کی اصطلاحات (TERMS) کے ساتھ ذہن نشین کرنا چاہتے ہیں اور ٹھوکر کھاتے ہیں۔ ہمارے نزدیک عالم برزخ ایک قبر[1] کے رقبے میں واقع ہے اور روح پر جو کچھ گذرتی ہے اس کا تصور باندھتے ہوئے مادّیت کے خوگر ذہن کی وجہ سے مجبور ہوتے ہیں کہ روح و جسد میں حیات ارضی کے نمونے پر جوڑ لگا دیں۔ جسد سے آزاد روح کا تصوّر کرنا ہمارے ذہن کی عادت کے خلاف ہے۔ یہیں سے ساری غلط فہمیاں شروع ہوتی ہیں۔ ہم ایک قبر کو دیکھ کر خیال کرتے ہیں کہ مردہ اسی کے رقبے میں عالم برزخ کی منازل کو طے کر رہا ہے اور اپنے اُسی مادّی جسد کے ساتھ طے کر رہا ہے جو اس قبر میں مدفون ہے۔ پھر انہی غلط فہمیوں کے ساتھ ہم اُس عالم سے متعلق آیات و احادیث کا مطالعہ کرتے ہیں، نتیجہ یہ کہ طرح طرح کے اشکالات میں الجھتے ہیں اور گوناگوں سوالات ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں۔ انہی اشکالات میں سے ایک سمع موتیٰ کا مسئلہ ہے۔

---

[1] احادیث میں بھی ہمارے مادّی ذہن کی رعایت سے عالم برزخ کے احوال کو احوال قبر کے پیرائے میں پیش کیا گیا ہے، لیکن قبر سے مراد وہاں دو گز رقبہ زمین نہیں، کیونکہ بہت سے مُردوں کو سرے سے قبر نصیب ہی نہیں ہوتی۔ حالانکہ احوال قبر کا سامنا

ارواح کے بارے میں یہ حقیقت واضح ہے کہ ان کو قبروں میں نہیں بلکہ سجّین اور علیین میں رکھا جاتا ہے جو عالم ارواح کے دو بڑے شعبے ہیں۔ ایک کی نوعیت حوالات کی سی ہے جس میں مجرمین کی ارواح قید میں ڈال دی جاتی ہیں، دوسرے کی حیثیت شاہی مہمان خانے کی سی ہے جہاں مقربین و صالحین کی ارواح کو سرکاری مہمان (STATE GUEST.) بنا کر رکھا جاتا ہے۔ یہ دونوں کے دونوں گروہ اپنے نتائج اعمال پانے کے لیے اللہ تعالیٰ کے شاہی دربار کے انعقاد کا انتظار کرتے ہیں۔ قرآن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں شعبوں کی ارواح کے روابط عالم مادی سے کٹ جاتے ہیں۔ "سمع" انسانی اصطلاح میں حرف و صوت کے جس سسٹم پر مبنی ہے اس کے کام کرنے کا انحصار ہوا کی لہروں اور آلۂ گوش کے طبل کی مناسبت پر ہے۔ ایک میت کا جسد ہی جب لقمۂ خاک ہو گیا، اس کا طبل گوش ہی ناکارہ ہو گیا، اس کے نظام اعصاب اور حسیات ہی کو جب معطل کر دیا گیا اور ہوا کی لہروں کو روکنے کے لیے جب تو دۂ ہائے خاک راستے میں حائل ہو گئے تو وہ سسٹم برقرار رہا ہی کب جسے ہم اپنے لغت میں لفظ "سمع" سے بیان کرتے ہیں۔

نبی صلعم کے حضور سے چند ایسی روایات ہم تک پہنچتی ہیں کہ جن کے انداز بیان سے سمع موتیٰ کے اثبات کا شبہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ان روایات کے ساتھ ہی ساتھ ہم تک خود صحابۂ کرام کا استعجاب و اضطراب بھی پہنچتا ہے جو ان کو سن کر معاً پیدا ہوا اور اسی وجہ سے پیدا ہوا کہ ایک مسلمہ حقیقت کے خلاف ایک مفہوم سامنے آتا تھا۔ لیکن ان روایات کے ساتھ وہ تاویل بھی ہم تک پہنچتی ہے جس کے ذریعے صحابہ کا اطمینان ہو گیا۔ یہاں باقی ساری روایات کو درکنار رکھ کر خاص طور پر آپ کی پیش کردہ حدیث پر گفتگو کی جاتی ہے۔ بتایا گیا ہے کہ چوبیس اکابر کفار کو گڑھے میں ڈلوانے کے بعد آپ اس کے کنارے کھڑے ہوئے اور ان میں سے ایک ایک کا نام اور اس کے باپ کا نام پکار کر فرمایا کہ "اے فلاں ابن فلاں، اے فلاں ابن فلاں!! کیا تمہارے لیے خوش آئند نہ ہوتا، اگر تم نے خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کی ہوتی؟ پس ہم نے تو درست پایا جو کچھ اللہ نے ہم سے وعدہ کیا تھا، تو کیا تم نے بھی اللہ کے کیے ہوئے وعدے کو برحق پایا؟"

روایت اگر اتنی ہی ہوتی تو اس کی یہ توجیہ کافی تھی کہ بسا اوقات کسی بے جان شے کی طرف

روئے سخن کر کے ایسی بات کہی جاتی ہے جس کا اصل مخاطب آدمی خود اپنے آپ کو بناتا ہے یا دوسرے سامعین کو۔ یہ اسلوب دنیا کا ایک معروف اسلوب ہے۔ اس کی ایک واضح مثال حضرت عمرؓ کا حجر اسود کو مخاطب بنا کر یہ کہنا ہے کہ یاد رکھ تو محض ایک پتھر ہے، ہمارا معبود نہیں، ہم تجھے بوسہ اس لیے دیتے ہیں کہ آنحضور صلعم نے ایسا کیا ہے (او کما قال) اس قول کے ذریعے پتھر کو متاثر کرنا مطلوب نہ تھا بلکہ ایک حقیقت کو حضرت عمرؓ اپنے ذہن میں راسخ کرنا چاہتے تھے، نیز اپنے رفقائے دین کو اس کا گہرا احساس دلانا چاہتے تھے۔ ٹھیک یہی توجیہ آنحضور صلعم کے اس تکلم کی کی جاسکتی ہے جو آپ نے سرداران کفار کے لاشوں سے فرمایا۔ لیکن روایت میں ایک جزء اور بھی ہے۔ آنحضور کے تکلم پر حضرت عمر چپ نہ رہ سکے اور آپ نے بے روح اجساد سے تکلم کیے جانے پر تعجب کا اظہار کیا۔ اس پر آنحضور صلعم نے فرمایا:۔

والذی نفس محمد بیدہ ما انتم باسمع لما اقول منھم	اس ذات کی قسم جس کے پنجے میں محمدؐ کی جان ہے، جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اسے تم ان سے بڑھ کر سننے والے نہیں ہو!

بظاہر ان الفاظ سے ایسا ہی محسوس ہوتا ہے کہ لاشے سُن رہے تھے اور اس روایت سے ایک سرسری نگاہ رکھنے والا قاری یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ مُردے اور لاشے سنتے ہیں۔ لیکن بخاری کے اسی سلسلۂ باب میں، جہاں یہ روایت مذکور ہے وہاں وہ روایات بھی تو ہیں جو صحابہ کے فہم روایت کو سامنے لاتی ہیں۔ حضرت قتادہ اس کی یہ تاویل پیش کرتے ہیں کہ احیاھم اللہ حتی اسمعھم قولہ توبیخا و تصغیراً و حسرۃ و ندما یعنی اللہ تعالیٰ نے ان لاشوں میں وقتی طور پر زندگی کی رَو دوڑا دی اور ان کے حسِ سماعت کو بیدار کر دیا، تا آنکہ ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سُنوا دیں۔ اس سے مقصود ملامت و تذلیل تھی اور پشیمانی اور ندامت کے احساسات کا اُبھارنا تھا۔ جس شخص سے براہ راست ٹکر لیتے ہوئے ان کی ساری عمریں گذری تھیں، اسی کے روبرو پڑے ہوئے اسی کی زبان سے ایک طرف یہ سننا کہ چکھ لیا مزہ اپنے کرتوتوں کا، اور دوسری طرف عالمِ آخرت میں اس کی دی ہوئی

پیشگی اطلاع کے مطابق جہنم کے شعلوں کی لپک کو آنکھوں سے دیکھنا انتہائی ذلت و نامرادی کا سماں پیدا کر دیتا ہے۔ بہر حال حضرت قتادہ اس صورت واقعہ کو معجزے کی حیثیت دیتے ہیں کہ خاص رسول اللہ کے لیے اس خاص لمحے ایک عمومی حالت کو بدل دیا گیا۔ اس توجیہ میں کوئی اشکال نہیں نظر آتا۔ اگر معجزانہ حیثیت سے موسیٰ علیہ السلام کے خطاب کو لکڑی کا ایک عصا سن سکتا ہے اور آپ کے ارشادات کی تعمیل کر سکتا ہے اور اس سے قرآن میں تضاد واقع نہیں ہوتا تو اس بات میں کیوں عدم امکان مانا جائے کہ آنحضورؐ چند لاشوں کو خطاب کریں اور وہ اسے ٹھیک اس طرح سنیں جیسے ایک زندہ انسان سنتا اور متاثر ہوتا ہے۔ اس چیز کی وجہ سے قرآن اور حدیث میں تضاد و تناقض کا ہونا کیوں تسلیم کر لیا جائے؟

دوسری توجیہ وہ ہے جو حضرت عائشہؓ نے فرمائی۔ ہشام کے والد نے ابن عمرؓ کے حوالے سے نوحہ کرنے اور مردے پر عذاب ہونے والی روایت حضرت عائشہ کی خدمت میں سمجھنے کے لیے پیش کی حضرت عائشہ نے اس کا مطلب واضح کرتے ہوئے اسی بدر کے واقعہ کو بطور مثال لیا۔ آپؓ نے لاشوں کے سمع کا صحیح مفہوم پیش کرنے کے لیے نبی صلعم کے قول کے اصل مدعا کو ذیل کے الفاظ سے بیان کیا:۔

انھم الآن لیعلمون ان الذی کنت اقول لھم ھو الحق یعنی یہ لوگ اب خوب سمجھ گئے ہیں کہ جو کچھ میں ان سے کہتا رہا تھا وہی حق تھا۔ زندگی میں میری جس دعوت کو یہ سننے پر تیار نہ ہوتے تھے اسے یہ آج خوب سنتے ہیں۔ گویا حضرت عائشہ بات کو یوں سمجھاتی ہیں کہ عالم ارواح یا عالم برزخ میں وہ لوگ ٹھیک اس انجام سے دوچار تھے جس کی خبر آنحضرتؐ نے دی تھی اور وہ آپ کی دعوت کی سچائی کو خوب جان چکے تھے "یسمعون" بمعنی "یعلمون" اس لیے لایا جاتا ہے کہ سماعت ذریعہ علم ہے، سنانا ہوتا ہی کسی حقیقت کا علم دینے کے لیے ہے۔ سو بدر کے مقتول سرداران کفار اس حقیقت سے براہِ راست دوچار تھے جس کے لیے نبی صلعم نے پوری کوشش کی کہ پردۂ غیب کے قائم رہتے ہوئے وہ اسے آپ سے سن کر پائیں۔ اللہ کا وعدہ ایک

طرف مسلمانوں کے ساتھ پورا ہوا اور دوسری طرف ان مقتولین اور ان کے پیرؤوں کے ساتھ!

پھر ابن عمرؓ اصل روایت میں ذرا سے تغیر کے ساتھ یہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بدر کے گڑھے پر رُکے اور کہا "کیا تم لوگوں نے اپنے رب کے کیے ہوئے وعدے کو برحق پایا؟ پھر فرمایا "جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، یہ لوگ اسے خوب سنتے ہیں" ابن عمرؓ نے اس واقعہ کا ذکر حضرت عائشہؓ سے کیا۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا: "انما قال النبی صلعم: انھم الآن لیعلمون ان الذی کنت اقول لھم ھو الحق" یہاں اصل روایت کے الفاظ ہمیں اس مفہوم سے مزید قریب کر دیتے ہیں جسے حضرت عائشہ نے اختیار فرمایا اور پوچھنے والوں کو بتایا۔

ان دونوں موقعوں پہ یہ چیز قابل توجہ ہے کہ خود حضرت عائشہ "انک لا تسمع الموتیٰ" اور "وما انت بمسمع من فی القبور" کی تلاوت بھی کرتی ہیں جن کا حوالہ آپ نے دیا ہے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ آپ بھی سمع موتیٰ کی نفی کی قائل تھیں۔ پھر جب حضرت عائشہ کو واقعہ بدر کی روایت اور قرآن میں کوئی تضاد و تناقض نہیں نظر آتا، بلکہ وہ ایک تاویلِ احسن پر مطمئن ہو جاتی ہیں اور دوسرے سائلین کو بھی مطمئن کرتی ہیں تو آخر آج نیا تضاد و تناقض کو نسا واقع ہو گیا۔

یہ دونوں توجیہات بالکل معقول اور قرینِ فہم ہیں اور ان میں سے جسے بھی اختیار کیا جائے مذکورہ بالا روایت کتاب الٰہی اور سنتِ نبوی کے فریم میں ٹھیک ٹھیک نصب ہو جاتی ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ ان دونوں توجیہات سے کتی کاٹ کر ایک ایسا مدعا اخذ کیا جائے جو خواہ مخواہ تضاد و تناقض ہی کو پیدا کرنے والا ہو۔ یہ طریقہ تو منکرینِ حدیث کا امتیازی (TYPICAL) معمول ہے کہ وہ بالکل آنکھوں کے سامنے موجود تاویلِ احسن کے لیے اپنے آپ کو اندھا بنا کر ابتغائے فتنہ کی وادیوں میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔

خدا ہمارے لیے اور آپ کے لیے امرِ حقیقی کے فہم کے دروازے کھول دے!

مزید اشکالات

سوال - ترجمان القرآن ماہِ اگست سنہ ۵۰ء میں "چند اشکالات" کا جو جواب ادارہ کی طرف سے شائع کیا گیا ہے اس کے متعلق چند معروضات ارسالِ خدمت ہیں۔ امید ہے کہ ان کا جواب باصواب عنایت فرما کر عند اللہ ماجور ہوں گے۔

(۱) جن حوادث کی خبر ایک صاحبِ وحی نے اتمامِ حجت کے بعد یا کسی کے مرنے جینے کے متعلق قبل از وقت دی ہو، کیا وہ مرنا اور جینا، فتح و شکست "علمِ حقیقت" کی رُو سے حق و باطل کا معیار ہے یا نہیں؟

(۲) اگر اس دنیا میں عقیدۂ صحیحہ اور اپنا کردار مذہبِ حقہ کے مطابق رکھنے والوں میں اور باطل کے پرستاروں میں فراخ روزی یا تنگ دستی سے دوچار ہو جانا معیارِ حق و باطل نہیں تو فرمائیں یہ جو حضرت نوحؑ اور حضرت ہودؑ کی زبانی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر تم لوگ میری اطاعت کرو گے اور اللہ تعالیٰ سے استغفار طلب کرو گے تو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچ جاؤ گے اور مقررہ میعاد تک تم کو مہلت ملے گی، وقت پر اللہ تعالیٰ تمہارے لیے بارشیں برسائے گا۔ اور مال و اولاد سے تمہاری مدد کرے گا۔ (۱۱/۵۲ ، ۷۱/۱۰،۱۱،۱۲) کیا یہ فراخی اور تنگیٔ رزق وغیرہ کے وعدے مذہبِ حقہ کے مطابق کردار رکھنے کا نتیجہ نہیں؟

(۳) اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے بیّن نشانات کے اظہار سے، جس سے حق و باطل میں فرق ہو جائے بقول آپ کے انسان کی وہ آزادیٔ رائے ختم ہو جاتی ہے جواسے ذمہ دار ہستی بنا کر قابلِ سزا یا سزاوارِ جزا بناتی ہے (اور) . . .   اکراہ فی الدین کی حالت قائم ہو جاتی ہے۔ تو پھر فرمائیں آپ کے سابق امیر صاحب نے جو قرآن کی طرف، یہ تعلیم منسوب فرمائی ہے کہ "یہ امت خدائی فوجداروں کی جماعت ہے (حالانکہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریمؐ کے متعلق فرمایا لَسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ یعنی آپؐ لوگوں پر داروغہ نہیں ہیں) جو اس لیے نکالی گئی ہے کہ وہ دنیا سے

ظلم (اور ظلم اللہ تعالیٰ نے شرک بتایا ہے) فتنہ، طغیان اور ناجائز استغفار کو بزور مٹا دے "۔
(فتنہ سے آپ کی مراد عقاید باطلہ ہیں) کیا اس کو زبردستی مٹانا اکراہ فی الدین نہیں ہے؛ دوسری عبارت یہ ہے کہ ". . . . . اور خدا نے رسولؐ کو دنیا میں زندگی بسر کرنے کا سیدھا راستہ اور حق کی اطاعت کا صحیح ضابطہ دے کر بھیجا ہے تاکہ تمام اطاعتوں (یہ لفظ دین کا ترجمہ کیا گیا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے دوسری طرف صاف طور پر مدینہ میں یہ حکم دیا تھا کہ لا اکراہ فی الدین، یعنی اطاعت کے صحیح ضابطہ کو منوانے کے لیے جبر نہیں کرنا) کو مٹا کر ایک اطاعت (یعنی دینِ اسلام) کو سب پر غالب کر دے"۔ کیا اس حکم سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ انسان کی وہی آزادی رائے ختم کرنا چاہتا ہے، کیا اس صورت میں قرآنی تعلیم میں اختلاف ثابت نہیں ہوتا؟

(۴) افسوس ہے کہ آپ لوگوں نے "شمعِ ناموس کے پروانوں" کو ایک طرف صحابہ سے مشابہت دی ہے اور دوسری طرف بہت بڑے پیمانہ پر وہ عیوب بھی گنے ہیں جن سے ان کی مشابہت مغضوب علیہم قوم سے ثابت ہوتی ہے۔ کیا اس امر سے صحابہ کی توہین کا ارتکاب نہیں کیا گیا؟

(۵) آپ کو جب یہ مسلم ہے کہ حق و باطل میں لمبی کشمکش ہوتی ہے اور کسی ایک لہر یا واقعہ کی کروٹ پر حکم قطعی نہیں لگایا جاسکتا کہ اب آخری فیصلہ ہو گیا ہے تو کیا اس امر سے یہ حکم لگانا کہ "قادیانیت . . . . . کے زوال کے آثار بالکل عیاں ہو گئے ہیں" آپ کی اپنی بیان کردہ حقیقت کی تردید نہیں؟

شجرۂ خبیثہ کی جو تعریف بیان کی گئی ہے وہ درست ہے ___ مگر یہ بتائیے کہ کیا اس شجر کے شجرۂ طیبہ ہونے میں آپ لوگوں کو کوئی شک ہے جو اپنی صدی سے اپنے تنے پر کھڑا ہے جس کی جڑیں اس قدر گہری زمین میں اُتر چکی ہیں کہ سارے پاکستان کے ملاّ نے اس کے اکھیڑنے سے عاجز ہو چکے ہیں۔

(۶) آپ کی طرف سے لو تقول علینا کی جو تاویل کی گئی ہے وہ سراسر غیر معقول ہے۔

جواب - آپ کے مکتوب میں سے وہ حصہ ہم نے ساقط کر دیا ہے جو سوالات پر نہیں بلکہ قادیانیت کی صداقت و عظمت کی تبلیغ پر مشتمل ہے۔ سوالات میں سے بھی کہیں کہیں غیر ضروری حصے حذف کر دیے گئے ہیں۔ آپ کی عبارت کی بے ربطی اور اس کے گنجلک پن پر ہمارا کوئی بس نہیں تھا، لہذا اس کا بار خود قارئین کو اٹھانا پڑے گا۔ جواب علی الترتیب درج ذیل ہیں:-

(۱) جی ہاں اللہ علیہ خبر دینے والا فی الواقع صاحبِ وحی ہو۔ لیکن تمام اخبارِ غیب اور تمام معجزات منکرینِ حق کے لیے اپنے اندر گنجائشِ تاویل ضرور رکھتے ہیں۔ امورِ طبعی میں فریبِ نفس نہیں چلتا، کیونکہ ایک سبب کا ایک ہی نتیجہ صراحت کے ساتھ بار بار تجربہ میں آکر اپنی واقعیت منوا لیتا ہے، لیکن امورِ وہبیہ میں افراد برسوں تک اور قومیں صدیوں تک فریبِ نفس میں مبتلا رہتی ہیں۔

(۲) یقیناً دینِ برحق پر چلنا اور اس کے غلبہ کی جدوجہد کرنا انسان کو اس نظامِ خیر و برکت تک پہنچا دینے کا ذریعہ ہے جس سے حیاتِ طیبہ حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اس جدوجہد کے دوران میں افراد کو طرح طرح کے مظالم اور ابتلاؤں سے گزرنا پڑتا ہے، اور بسا اوقات سالہا سال اس میں صرف ہوتے ہیں۔ اس جدوجہد کے دوران میں کسی فرد کے تنعم یا ابتلاء کو دیکھ کر فوراً یہ فیصلہ نہیں صادر کیا جا سکتا کہ وہ تو متبعِ حق ہے اور یہ منحرف۔ اسے نیکی کی جزا مل رہی ہے اور اسے بدی کی سزا۔ یہ حقیقت اگر آپ تسلیم نہ کریں تو بڑے اشکال پیدا ہوں گے۔ مثلاً غلبۂ دین کی جدوجہد کے دوران میں جو کچھ حضرت نوح علیہ السلام، حضرت زکریا علیہ السلام، حضرت یحیٰی علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دوسرے انبیاء اور ان کے رفقاء پر گذری اور اس کے مقابل میں جو ٹھاٹھ باٹھ مخالفینِ حق کے تھے اس کے بارے میں کیا رائے قائم کی جائے گی؟ آنحضور صلعم کے پیرووں کو دورانِ جدوجہد میں کیا حالات پیش آئے اور ان کے حریفوں کا عالم کیا تھا؟ پھر صحابہ میں سے وہ بھی تھے جو اسلام کے قبول کرنے میں جس دورِ ابتلا سے دوچار ہوئے اسی میں وہ شہادت کی منزل تک جا پہنچے۔ ان کی زندگی میں کہاں سے فراوانئ رزق اور تمکن فی الارض اور دوسرے انعاماتِ الٰہی کا مظاہرہ آپ تلاش کر کے نکالیں گے؟ امام حسینؓ، امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور امام ابوحنیفہؒ کی صف کو ایک طرف کھڑا کر کے اور دوسری طرف

بنوامیہ کے حکمرانوں کو سامنے لا کر غور کیجیے کہ آپ کے نقطۂ نظر سے فریقین کی پوزیشن کیا قرار پاتی ہے؛ مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ، شاہ اسمٰعیل شہید، اور سید احمد شہید بریلوی رحمہم اللہ اجمعین کو اکبر اور جہانگیر اور سلطنت برطانیہ اور سکھوں کی حکومت کے بالمقابل جدوجہد کی حالت سے گزرتے ہوئے تاریخ میں ملاحظہ فرمائیے اور پھر مسئلہ کو سوچیے۔ دو اصولی باتیں یاد رکھیے:۔

— دینِ برحق پر چلنے کے نتائجِ حسنہ دنیا میں پوری طرح اجتماعی زندگی میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

— یہ نتائج بھی جدوجہد کی تکمیل پر برآمد ہوتے ہیں، جدوجہد کے دوران میں گوناگوں حالات سے گذرنا پڑتا ہے۔

(۳) نبی صلعم کی ایک حیثیت تھی داعی کی، دوسری حیثیت تھی ایک سوسائٹی کے معمار اور ایک ریاست کے منتظم کی۔ پہلی حیثیت میں آپ کے سامنے کام کا دارومدار مجرد دلیل کے ذریعے افہام و تفہیم پر تھا۔ دوسری حیثیت میں آپ نے جنگیں کیں اور تلوار کے ذریعے فتنہ و فساد کی روک تھام کی۔ عدالت کی کرسی پر تشریف فرما ہوئے اور قانون کے کوڑے کو حرکت دے کر جرائم کی روک تھام کی۔ یعنی جہاں تک اسلام کے عقیدہ و فلسفہ کو منوانے کا تعلق ہے اس میں جبر روا نہیں رکھا گیا، لیکن جہاں تک اسلام کے اجتماعی نظام کو چلانے کا معاملہ ہے پوری کی پوری اجتماعی قوت اس کام میں استعمال کی گئی۔

لست علیھم بمصیطر کا تعلق کارِ دعوت سے ہے۔ لیکن اجتماعی نظام کے تقاضوں کے لحاظ سے آپ کو احکام دوسرے دیئے گئے، مثلاً یہ کہ یا ایھا النبی جاھد الکفار والمنافقین و اغلظ علیھم، یا مثلاً وان احکم بینھم بما انزل اللہ۔

آپ براہِ کرم دعوت کے اصولوں اور اجتماعی نظام کے تقاضوں میں فرق کریں۔

(۴) یہ مناظرانہ ذہن کے طرزِ فکر کی ایک افسوسناک مثال ہے۔ ایک شخص اللہ کی ایک سنت کو معلوم کرنے کے لیے انبیاء اور صحابہ کی دعوت و تحریک کا مطالعہ کرتا ہے اور پھر اس سنت کو سامنے رکھ کر اپنے گردوپیش کے احوال کے بارے میں رائے قائم کرتا ہے، اس پر آپ فرماتے ہیں کہ اس نے

عام مسلمانوں کو جن میں اچھے جذبات کے ساتھ عملی کمزوریاں بھی ہیں، (اور ان کمزوریوں کو ہم اس لیے سامنے لاتے ہیں کہ ان کی اصلاح ہو) صحابہ سے مشابہت دے کر صحابہ کی توہین کر دی۔ انہی باتوں سے قادیانی ذہن پہچانا جاتا ہے۔

(۵) اس سوال کا جواب انہی سطور میں موجود ہے جن کو دیکھ کر آپ نے یہ نئے سوالات اٹھائے ہیں۔ بہت سے اشجار خبیثہ دنیا میں ایسے موجود ہیں جو ہزار ہزار سال سے اپنے تنوں پر کھڑے ہیں اور بہت سے گمراہ گروہوں کا حال یہ ہے کہ کئی قرنوں سے ان کی تجارتیں چمک رہی ہیں، ان کا رہن سہن عیاشانہ اور پر تنعّم ہے اور ان کو دوسروں پر تسلط و اقتدار حاصل ہے۔ لیکن یہ لمبی لمبی مدتیں قانونِ الٰہی کی نگاہ میں بالکل حقیر ہیں اور یہ گروہ آہستہ آہستہ اپنے انجام کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں۔ پھر بھی آپ کو اگر قادیانیت کے شجرۂ طیبہ ہونے کا اور اس کے پھلنے پھولنے کا یقین ہے تو معاملہ بحث کا نہیں، اس پر تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ تربصوا فانی معکم من المتربصین!

آپ نے اپنی جماعت سے اختلاف کرنے والے علماء و قائدین کے لیے "ملّانے" کا لفظ استعمال کر کے کسی اچھے شریفانہ ذہن و اخلاق کا مظاہرہ نہیں کیا۔ آدمی کو اپنی زبان ہمیشہ پاکیزہ و مہذب رکھنی چاہیے۔ اور اختلاف کرنے والوں کے جذبات پر نشتر چلا چلا کر ایسے اسباب پیدا نہیں کرنے چاہئیں جن سے عام ذہنی و خارجی فضا مکدّر ہو کے رہ جائے۔

(۶) میری درخواست یہ ہے کہ ایک بار پھر اس آیت کی تشریح پر نظر ڈالیے اور اس کے بعد دوبارہ اپنے سوال کا جائزہ لیجیے۔ آپ نے غور نہیں فرمایا کہ دو مختلف صورتیں الگ الگ بیان کی گئی ہیں، ایک یہ کہ ایک عام آدمی اللہ تعالیٰ کے بارے میں افترا کرے، دوسرے یہ کہ ٹھیک وہ شخص اللہ تعالیٰ کے بارے میں افتراء کرے جسے اللہ نے مامور ہی اس کام پر کیا ہو کہ وہ مفتریوں کے کیے کرائے کو ختم کرنے کے لیے امرِ حق کی تبیین کر دے۔ دونوں میں فرق وہی ہے جو ایک عام شہری کے ڈاکہ ڈالنے میں، اور ایک کوتوال کے ڈاکہ ڈالنے میں ہے، یا وہی فرق ہے جو ایک عام آدمی کی خیانت میں اور ایک وزیر کی خیانت میں ہو سکتا ہے۔ قانونِ الٰہی میں ان دونوں صورتوں پر کارروائی مختلف ہوتی ہے۔ آیت

مذکورہ بالا اختصاص اس صورت سے تعلق رکھتی ہے کہ خدا کا مقرر کیا ہوا ایک نبی و رسول اگر اپنی اتھارٹی اور اپنے عہدہ کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے وحی کے پہنچانے میں خیانت کرے اور اپنی طرف سے غلط باتیں خدا سے منسوب کر دے تو اس کے ساتھ اللہ کے قانون کا معاملہ کیا ہوگا! ورنہ مسلمانوں کی تاریخ شاہد ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق اس امت میں متعدد کذابوں نے دعوائے نبوت کیا ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ نے اُن میں سے کسی ایک کی بھی گردن کاٹی ہے ؟

آپ اگر اِن دونوں صورتوں میں فرق نہیں کر سکتے تو کسی کا آپ پر کوئی زور تو نہیں ہے۔ لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ۔

اعلان

قارئین "ترجمان" میں سے بہت سے حضرات دفتر میں سوالات ارسال فرماتے ہیں اور اپنا مکمل پتہ تحریر کرنے کے بجائے "ترجمان" کے ذریعے جواب کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ایسے حضرات کی خدمت میں گذارش ہے کہ ہمارے پاس کثرت سے سوالات آتے ہیں اور ہر سوال کا جواب ترجمان میں دینا نہ ممکن ہوتا ہے اور نہ ضروری اور مناسب۔ اس کے علاوہ بہت سے سوالات کے جوابات کتب و رسائل میں پہلے سے دیے جا چکے ہیں۔ اس لیے آپ سے درخواست ہے کہ سوال کے ساتھ مکمل پتہ بھی لکھ دیا کریں، تاکہ اگر ضرورت ہو تو جواب ذاتی طور پر ڈاک سے بھی دیا جا سکے۔ بصورت دیگر جن سوالات کا جواب "ترجمان" میں دینا ممکن نہ ہوگا یا جن کا جواب پہلے دیا جا چکا ہوگا اُن کا جواب کسی شکل میں بھی ہم دینے سے معذور ہوں گے۔

(ادارہ)

رسائل و مسائل حصہ اول نیا اڈیشن

یہ مولانا سیدابوالاعلی مودودی کی وہ ہمہ گیر کتاب ہے جسکا مطالعہ آپکو زندگی کے ہر پہلو سے متعلق نہایت مفید معلومات بہم پہنچائیگا اس کتاب میں اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں عملی زندگی کی بے شمار گتھیوں کا ایسا حل پیش کیا گیا ہے جو ہر طالب حق کے دل و دماغ کو اپیل کرتا ہے ۔ اس میں تفسیر آیات و تاویل احادیث' فقہی مسائل ، خلافیات' عام مسائل' معاشی مسائل' سیاسی مسائل' کارو باری مسائل اور تحریک اسلامی کے متعلق بے شمار مسائل زیر بحث آئے ہیں ۔
قیمت پانچ روپے چار آنے

پاکستانی عورت دو راہے پر نیا اڈیشن

ہمارے ملک کی عورتیں اس وقت ایک دو راہے پر کھڑی ہیں اور ہمارے ارباب کار پورا زور لگا رہے ہیں کہ ان کو اسلام کی سمت سے ہٹا کر جاہلیت کے رخ پر ڈالدیں - مولانا امین احسن صاحب اصلاحی نے یہ کتاب لکھ کر اس حقیقت واشگاف کر دیا ہے کہ مغرب کی یہ اندھی تقلید جس کی طرف اس وقت پاکستانی عورتیں دھکیلی جا رہی ہیں صرف ہمارے دین ہی کے خلاف نہیں ہے بلکہ ہماری دنیا سنورنے کی بھی کوئی توقع نہیں کی جاسکتی - مولانا نے اپنے مخصوص ادیبانہ انداز میں نہایت خوبی کے ساتھ یہ ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے کہ اس روش میں خواہ ظاہری چمک دمک کتنی ہی ہو لیکن ہمارے قومی و ملکی مفاد کے لئے یہ سخت نقصان دہ ہے اور ہماری حقیقی قومی ضرورتیں ان حدود کے اندر بدرجہ اتم پوری کی جاسکتی ہیں جو اسلام نے عورتوں کے لئے مقرر کئے ہیں - قیمت تین روپے

پردہ

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی معرکۃ الاراء تصنیف پردہ کا نیا ایڈیشن چھپ کر آگیا ہے - اس جامع کتاب میں مختلف تہذیبوں کے عروج و زوال اور تاریخ تمدن کا تفصیلی جائزہ لیکر فاضل مصنف نے یہ ثابت کر دیا ہے - کہ جب کسی معاشرہ میں مردوزن کا اختلاط حدود مذہب و اخلاق کو پھاند جاتا ہے تو اسکی تباہ کاریاں کس طرح پوری قوم کو بالکل کھوکھلا اور نکما بنا کر رکھ دیتی ہیں اسلام اسی خطرہ کے سدباب کےلئے پردہ کا حصار قائم کرتا ہے۔ تفصیلات کیلئے اصل کتاب ملاحظہ فرمائیں۔
سائز $\frac{30 \times 20}{16}$ دیدہ زیب گرد پوش . . . . قیمت چار روپے

اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ

شاہ ولی اللہ صاحب دھلوی کے ایک اہم رسالہ کو مولانا صدر الدین صاحب اصلاحی نے نہایت شستہ اردو میں ترجمہ کیا ہے شاہ صاحب نے اپنے اس رسالے میں مختلف فقہی مذاہب کے ارتقاء اور تاریخی پس منظر کا تفصیلی جائزہ لیکر واضح کیا ہے کہ ابتداء میں یہ اختلافات کس نوعیت کے تھے اور آج ان کو کیا شکل دیدی گئی ہے نیز آپنے ان مختلف فقہی مسلکوں سے پورا فائدہ اٹھانے اور دین کو سمجھنے میں انسے مدد لینے کے لئے ایک راہ اعتدال بھی پیش کی ہے - قیمت دو روپے

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان اچھرہ - لاہور

سرورق جدید اردو ٹائپ پریس ، لاہور میں چھپا